اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

کراچی میں خون خرابہ کا ذمہ دار کون

اس شمارے میں
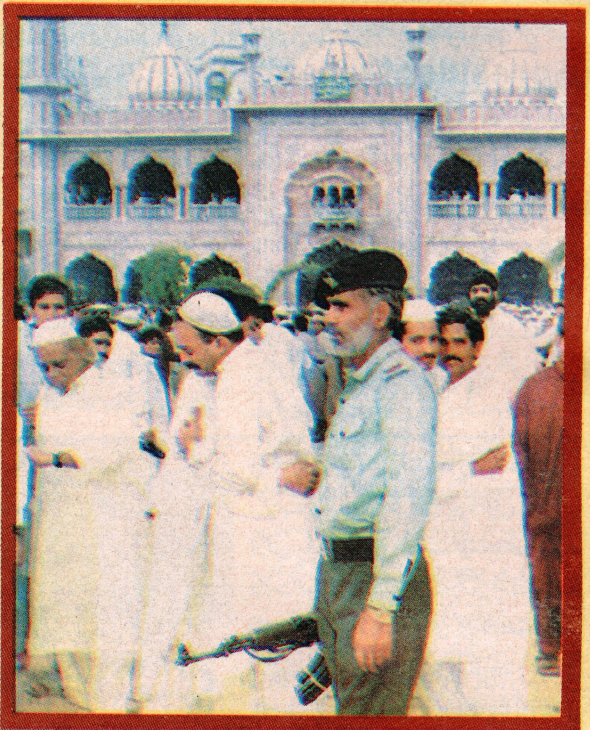
مہاراشٹر میں شیو سینا۔ بی جے پی حکومت کے قیام کے بعد کیا

بال ٹھاکرے بمبئی سے مسلمانوں کو نکال پھیکیں گے؟

AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRILANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	£ 1.30
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3.400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	US $ 3.00

بابری مسجد کے انہدام کے بعد سے مسلسل

یوپی بی جے پی کی ساکھ انہدام پذیر

مہاراشٹر اور گجرات میں انتخابی کامیابی حاصل کرنے پر جہاں بی جے پی کے حلقوں میں زبردست جوش وخروش ہے وہیں اتر پردیش میں تیزی سے گرتی ہوئی پارٹی کی ساکھ سے پارٹی لیڈروں میں مایوسی کی فضا بھی پیدا ہوگئی ہے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ نہیں ہے کہ یوپی میں پارٹی اقتدار سے باہر ہے بلکہ تشویش اس سے ہے کہ جس بنیاد پر لیڈروں کو ناز تھا وہی کھسک رہی ہے۔ کہا جاتا تھا کہ ہندوستان میں بی جے پی ہی ایک ایسی جماعت ہے جس میں اندرونی جمہوریت اور نظم وضبط کی حکمرانی ہے لیکن گذشتہ دنوں وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے اسی بنیاد پر بھرپور حملہ کیا اور پارٹی کے چھ ممبران اسمبلی نے وہپ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملائم سنگھ کے حق میں ووٹ دے دیا۔ ان میں سے تین نے تو کھل کر بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ بعد میں ایک ممبر اسمبلی کو پارٹی مخالف سرگرمیوں کے الزام کے تحت معطل کردیا گیا۔ لیکن اس دل بدلی پر اعلیٰ کمان کی جانب سے بٹھائی گئی کمیٹی نے ابھی تک اپنی رپورٹ پیش نہیں کی۔

دیکھا جائے تو بابری مسجد کے انہدام کا قہر بی جے پی پر ٹوٹ رہا ہے اور اسی وقت سے بی جے پی کی ساکھ مسلسل منہدم ہورہی ہے۔ پہلا جھٹکا تو اسے چار ریاستوں میں اپنی حکومتوں سے ہاتھ دھونے کی شکل میں لگا تھا۔ اس کے بعد اتر پردیش کی سطح پر بی جے پی کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی حالات اس کے لئے بہت ہی خراب ہیں۔ آپسی رسہ کشی اور جوتم پیزار کا ماحول ہے۔ ریاستی یونٹ کے عہدیداروں میں رابطہ کی شدید کمی ہے اور مرکزی سطح پر بھی جس کی جو مرضی ہوتی ہے وہ قدم اٹھاتا اور بیان دے دیتا ہے۔ پچھلے دنوں جب وشو ہندو پریشد نے بنارس میں اکٹھا ہوکر مسجد گیان واپی کی نام نہاد آزادی کا اعلان کیا تو بی جے پی کے بڑے لیڈروں نے اس کی حمایت نہیں کی، واجپئی نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور گیان واپی مسجد کے خلاف کوئی تو تحریک نہیں چلائی جاسکتی جب کہ پارٹی کے دو ممبران پارلیمنٹ اوما بھارتی اور شریش چندر دیکشیت نے اس کی حمایت کا اعلان کیا اور پروگرام میں شرکت کرنے بنارس بھی پہنچے۔ حالانکہ وشو ہندو پریشد کے جوائنٹ جنرل سکریٹری نے اعلان کیا تھا کہ اس پروگرام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن نہ صرف دوسری جگہوں کے عوام بلکہ خود بنارس کے ہندوؤں نے بھی اس دعوے پر یقین نہیں کیا اور وہ لوگ جو برابر کاشی مندر میں پوجا کرتے ہیں اس دن نہیں آئے۔ بی جے پی کی اس میں شرکت نہ کرنے کی وجہ یہی سیاسی ہی تھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ فی الحال اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس لئے بی جے پی اس ایشو کو الیکشن پلیٹ فارم بنانے سے گریز کررہی ہے۔

اگر بی جے پی کی یوپی یونٹ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر لیڈر اپنی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے۔ کلیان سنگھ منہ اٹھائے کسی دوسری طرف جارہے ہیں تو کلراج مشرا دوسری سمت کا رخ کئے ہوئے ہیں۔ کلیان سنگھ بی جے پی کے نائب صدر اور یوپی اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر ہیں جب کہ کلراج مشرا یوپی بی جے پی کے صدر ہیں لیکن دونوں پارٹی پر اپنی گرفت قائم کرنے میں ناکام ہیں۔ پارٹی کی عوامی ساکھ بھی ختم ہوتی جارہی ہے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی بہانہ ہی نہیں ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد کوئی ایسا جذباتی ایشو ان کے پاس ہے ہی نہیں جسے یہ لوگ پلیٹ فارم بنا سکیں۔ جس کی بنا پر یہ بھی کانگریس کی مانند عوام سے دور ہوتی جارہی ہے۔

ادھر دوسری طرف ملائم سنگھ نے بی جے پی کے باغی ممبران کا قرض اتارنے کے لئے ان کے اسمبلی حلقوں کا دورہ کیا اور وہاں ترقیاتی اسکیموں کا اعلان بھی کیا ہے باغی ممبر ہرپال پنوار کے حلقہ مظفر نگر کا ملائم سنگھ نے 25 فروری کو اور دوسرے باغی ممبر سوامی پرمانند ڈانڈی کے حلقہ شاہ آباد کا 26 فروری کو دورہ کیا۔ انہوں نے اس موقع پر سڑک کی مرمت بجلی اور رامپور قصبہ کی خوبصورتی کے لئے 75 لاکھ کی امداد اور ایک چینی مل کے قیام کا اعلان کیا۔

سیاسی حلقوں میں ایسی چہ میگوئیاں بھی ہیں کہ مذکورہ دونوں باغی لیڈر ناراض بی جے پی ممبران اور ملائم سنگھ کے درمیان رابطے کی کڑی بن رہے ہیں۔ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اگلے چند مہینوں میں کم وبیش ایک درجن ممبران اسمبلی بی جے پی سے ٹوٹ کر ملائم سنگھ کے ساتھ چلے جائیں گے۔ بی جے پی کی ریاستی یونٹ ان ناراض ممبران کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنے پر مرکزی قیادت سے خفا بھی ہے۔ دراصل مرکزی قیادت نے یہ سوچ کر کوئی کارروائی نہیں کی کہ کہیں اس کا الٹا اثر نہ پڑے اور کئی دوسرے ممبران بھی بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کردیں۔

بی جے پی کی اس ابتر حالت پر آر ایس ایس کو بھی بہت تشویش ہے، گذشتہ دنوں کانپور میں آر ایس ایس کے دوروزہ اجلاس میں اس پر اپنی فکر مندی کا اظہار کیا گیا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ سنگھ پریوار میں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جارہا ہے کہ بی جے پی کی ریاستی یونٹ پر آر ایس ایس کی گرفت ہونی چاہیے۔ تاکہ اسے کانگریس کے نقش قدم پر جانے سے روکا جاسکے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ریاستی یونٹ کے عہدیداروں میں پھیر بدل کردیا جائے اور آر ایس ایس کے لوگوں کو کلیدی عہدوں پر بٹھا دیا جائے۔ کلراج مشرا کی مدت آئندہ جولائی میں ختم ہورہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی جگہ پر راج ناتھ سنگھ جو کہ ریاستی یونٹ کے سابق جنرل سکریٹری ہیں، کو صدر بنادیا جائے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ سابق وزیر تعلیم راج ناتھ سنگھ کو کلیان سنگھ کی جگہ نائب صدر بنادیا جائے۔ اور کلیان سنگھ کو حزب اختلاف کا لیڈر بنا رہنے دیا جائے۔ سنگھ کے بارے میں یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ سنگھ پریوار کے قریب ہیں اور آر ایس ایس کے چیف راجیندر سنگھ سے ان کے گہرے روابط ہیں۔

دوسو سال قبل بنارس کے پنڈتوں نے

گیان واپی مسجد کو توڑنے کی مخالفت کی تھی

گذشتہ دنوں مہاشیوراتری کے موقع پر پریشد کی طاقت آزمائی نے سنگھ پریوار کے سیاسی عزائم پر سے پردہ اٹھادیا ہے۔ لوک سبھا انتخابات کے وقت سے پہلے منعقد ہونے کے اور اتر پردیش میں وسط مدتی الیکشن کے خدشات نے آر ایس ایس میں پریشانی کی فضا پیدا کردی ہے۔ اگر بی جے پی آئندہ عام انتخابات کے دوران واحد بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھرتی ہے تو جنوب میں وہ اپنی پوزیشن کافی مضبوط کرلے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنوبی ہندوستان میں شیو کی پوجا بڑے اہتمام سے ہوتی ہے اسی لئے لوک سبھا الیکشن سے قبل جذباتی ماحول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور مہاشیوراتری کو جس دن بنارس میں ملک بھر سے لاکھوں ہندو افراد اکٹھا ہوتے ہیں ان لوگوں نے اپنے حق میں کیش کرانے کی کوشش کی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اتر پردیش میں بھگوا طاقتیں پھر سے متحد ہونا چاہتی ہیں کیونکہ وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ کی ذات پات کی سیاست نے اس اتحاد کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

اگر گذشتہ دنوں کے واقعات پر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ دہلی اور اتر پردیش کی حکومتیں بھی سنگھ پریوار کی مانند کاشی کی مہم سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں مرکز نے بنارس کے معاملے میں سخت قدم اٹھاکر مسلمانوں کے اعتماد کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کی جو کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد کانگریس سے یکسر دور ہوگیا ہے۔ یوپی حکومت نے بھی مرکز کی مانند ضرورت سے زیادہ جوش وخروش دکھاکر حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وشو ہندو پریشد بنارس میں بھیڑ اکٹھا کرنے میں ناکام رہی جب کہ یہ ایک ناپختہ خیال ہے بنارس میں جو لوگ آئے وہ خود بخود نہیں آگئے تھے۔ جہاں تک مقامی حمایت کی بات ہے تو اجودھیا میں بھی پریشد کی کال کو مقامی حمایت حاصل نہیں تھی۔ بنارس میں عام ہندو پریشد کی کال سے متفق نہیں ہے وہ اپنی تجارت کو ایک مہم کے لئے برباد کرنا نہیں چاہتا وہاں پر دونوں فرقوں کے اقتصادی مفادات ایک دوسرے سے وابستہ اور جڑے ہوئے ہیں۔ مرکز کی ضرورت سے زیادہ احتیاط کو "دودھ کا جلا دہی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے" کے مصداق بتایا جاتا ہے۔ کانگریسی حکومت اسی بہانے مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ نرسمہا راؤ نے اقلیتوں میں پارٹی کی امیج کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ ادھر ملائم سنگھ کے بیان سے بھی کچھ نتیجہ برآمد ہوا ہے مسلمان ملائم سنگھ پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں بمقابلہ ارجن سنگھ کے جنہوں نے کہ بابری مسجد کے انہدام پر مطالبہ کیا ہے کہ کانگریس مسلمانوں سے معافی مانگے مسلمان این ڈی تیواری پر بھی اعتماد نہیں کررہے ہیں اسی لئے ملائم نے مسلمانوں کے اعتماد کو برقرار رکھنے اور اس کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی تھی۔

دیکھا جائے بنارس کا معاملہ اجودھیا سے الگ ہے اجودھیا کی بابری مسجد کے برعکس بنارس کی گیان واپی مسجد کی مندر کے ملبے پر تعمیر کرکے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ پھر بھی بنارس میں اس معاملے کو لے کر کبھی بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کا ماحول نہیں بنا

باقی ص ۳۴ پر

اگر پاکستانی آپس میں لڑتے رہے تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتا ہے

پروفیسر محمد حسن کی فکر انگیز تحریر

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست وبازو کو، جی ہاں پاکستان کے جسم پر جو زخموں کی قبا سجی ہے اسے دیکھ کر قاتل کے دست وبازو کو نظر لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہ قاتل کون ہے اور کہاں چھپا ہوا ہے اس کی تلاش جاری ہے اتنی بات طے ہے کہ۔ میں ہوں یا آپ ہوں گھر میں کوئی آیا نہ گیا۔

فوراً ذہن اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ بے نظیر حکومت نااہل ہے کہ وہ ان بلوؤں کو روک نہیں سکتی۔ اس الزام کی نشر واشاعت میں اگر کسی قسم کی کمی رہ گئی ہے تو اسے پورا کرنے میں ہماری ہندوستانی حکومت کے ذمہ داران، ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات سب دن رات لگے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بین الاقوامی اداروں میں بھی ہمارے سفیر اور نمائندے سرگرم کار ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ پچھلے چند سال میں بے نظیر بھٹو کی حکومت نے کبھی اپنے مخالفوں کی مخالفت کرنے کی غرض سے کچھ کشمیر کی صورتحال سے نبٹنے کے لئے بین الاقوامی اداروں میں کشمیر کا مسئلہ اٹھانا شروع کیا کہیں تھوڑی بہت کامیابی ملی کہیں نہیں ملی۔ اتنا تو ہوا کہ مس رافیل اور ان کے ہمنوا امریکی افسر بھی اس مسئلے کو مسئلہ سمجھنے لگے اب اس کا توڑ یہی ہے کہ ہندوستان کی سرکار پاکستان کے داخلی خلفشار کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرے کہ ساری دنیا مان لے کہ پاکستان سے تو اپنا آپا ہی نہیں سنبھلتا ان بچاروں سے کشمیر کیا سنبھلے گا۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ آج کل "دشمن" ملکوں کے سفارت خانے ایک دوسرے کی مملکت میں خلفشار پیدا کرنے کا آلۂ کار ہی ہوتے ہیں خواہ وہ ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانہ ہو یا پاکستان میں ہندوستانی سفارت خانہ۔ لہذا کچھ انوکھی بات نہیں ہوئی کہ ہندوستانی سفارت خانہ کراچی میں بند کردیا گیا۔ اور وہ بھی عین اس وقت جب کراچی میں ہنگامے خاصے بڑے پیمانے پر ہونے لگے۔ (اسی قسم کی شرارت ہندوستان میں بھی ہوتی رہتی ہے خاص طور سے پنجاب میں پاکستان گڑبڑ مچاتا رہا ہے) اس طرح کے فسادات کے سلسلے میں دو باتیں اور بھی یاد رکھنے کی ہیں ایک یہ کہ پاکستان میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان تنگ نظری اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرنے سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتا ہے اور اس کی وحدت اور سالمیت کو مہلک خطرہ ہوسکتا ہے مہاجر پہلے ہی سے روٹھے بیٹھے ہیں اس کے بعد صوبوں کا اپنا ٹکراؤ الگ ہے اس پر مستزاد شیعہ سنی جھگڑا، اور مسلمان عیسائی جھگڑا شروع ہوجائے تو گویا پاکستان ہی بیٹھ جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کے جھگڑے کی شروعات عام طور پر اچانک نہیں ہوتی خاص طور پر پاکستان میں۔ بلکہ عام طور پر یہ تناتنی بیرونی طاقتوں کے ذریعے پیدا کرائی جاتی ہے اور اب تک اس قسم کے تنازعے ہمیشہ حکومت کی اچانک تبدیلی کی شکل میں ختم ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے آخری زمانے میں اسی قسم کی جھگڑے چلتے رہے ہیں اور ایک دن اچانک فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔

یہ بات ہندوستان میں عام پڑھنے والوں کو سمجھ میں نہیں آئے گی کیونکہ یہاں فوج نے کبھی اقتدار نہیں سنبھالا ہے مگر پاکستان میں ہر قسم کے تنازعات کا انجام اسی قسم کی حرکت پر ہوتا ہے۔ حال میں فوج کی جگہ متبادل انتظام غیر منتخب نمائندوں کا ہوگیا اور جب سابق صدر پاکستان نے پہلے بے نظیر بھٹو اور پھر نواز شریف کو برخاست کردیا تھا تو اچانک معین قریشی صاحب وزیراعظم بن گئے تھے۔ فوج نہ سہی فوج کا منظور نظر سہی۔ گویا جس کے سر پر فوج جوتی رکھ دے وہی صدر ٹھہرے اور پھر سارا آئین واقتدار اس کا مرہون منت ہوجائے۔

ایک اور زاویہ نظر سے غور کیجئے تو یہاں نواز شریف بھی کہیں نہ کہیں نظر آتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت بہت تھوڑی اکثریت پر قائم ہے اور نواز شریف پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ان کے لئے کوئی دشوار نہیں ہے کہ مہاجر قومی تحریک سے مل کر پاکستان کے سب سے بڑے اور کلیدی شہر کراچی میں قیامت صغریٰ کا انتظام کردیں تاکہ بے نظیر بھٹو کی حکومت یا تو آئے دن کی بدنظمی کی شکار ہوجائے یا اس کے باقاعدہ برخاست کئے جانے کا جواز پیدا ہوجائے۔ امریکا کسی نہ کسی اقدام کے لئے مجبور ہوجائے اس کے لئے امریکی سفارت خانے میں قتل عام کا ڈراما بھی سمجھ میں آتا ہے۔

رہے میاں الطاف حسین جو مہاجر قومی تحریک کے سربراہ ہیں ان کی قومی تحریک پہلے ہی بٹ چکی ہے مگر مہاجروں کے نرغے میں ان کا وقار اب بھی بلند ہے اور حقیقی اور حق پرست، دونوں ہیں تو بہرحال مہاجر۔

اس پر اضافہ کیجئے مذہبی منافرتوں کا۔ عیسائیوں کا معاملہ تو وقتی تھا اس کو بھی بہت۔ جھنڈے پر چڑھایا گیا کہ اس سے پاکستان کی سالمیت پر ضرب پڑتی تھی۔ اب شیعہ سنی مناقشے کو ہوا دی جارہی ہے اور روزانہ سنی اور شیعہ مساجد میں قتل عام کی خبریں چھپ رہی ہیں۔ ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کو موقع ملنا چاہئے ہر چھوٹی موٹی خبر کو بھی وہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں خاص طور پر دلی میں بی جے پی کی حکومت بننے کے بعد اور مرکز میں نرسمہاراؤ سرکار کے متعصبانہ رویے کے پیش نظر اور اب تو گجرات اور مہاراشٹر کی حکومتوں سے اس قسم کی فرقہ پرستانہ ذہنیت اور پاکستان دشمنی میں اور بھی زیادہ تیزی اور استقامت پیدا ہوگئی ہے۔

ہندوستانی میڈیا کے اس قسم کی خبروں سے ایک نہیں کئی مقاصد ہیں۔ ایک تو کشمیر کے تنازعے میں پاکستان کی پیش رفت کو ختم کرنا اور بین الاقوامی سطح اور پھر قومی سطح پر بھی اس کا مضحکہ اڑانا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی رائے عامہ کو پاکستان سے متنفر کرنا اور پاکستان کو ان کی نظروں میں ذلیل کرنا۔ دوسری طرف ہندوستان کے مسلمانوں کو بی جے پی اور شیوسینا کی اطاعت اور فرماں برداری پر راضی کرنا کہ ان پر یوں بھی پاکستانی ہونے کا لیبل چسپاں ہے۔ تیسرے عالمی سطح پر امریکی لابی کی حمایت کرنا کہ لیجئے صاحب، پاکستان تو انتہائی تنگ نظر، کٹر پنتھی ریاست ہے اس کی دہشت گردی سے ہمیں بچائیے اور ہماری پشت پناہی فرمائیے اور چوتھے پاکستان میں فرقہ وارانہ نفاق کا ایسا بیج بونا جو دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور ایسا تناور درخت بن جائے کہ پورے پاکستان کو نگل جائے۔

بے شک پاکستان کے کچھ مسائل ہیں اور ان میں سب سے بڑا مسئلہ وہاں کے مختلف صوبوں اور قومیتوں کے درمیان مشترک مفاد دریافت کرنے اور اس کے حصول کے لئے مشترکہ جدوجہد میں شمولیت کے لئے آبادی کے بڑے حصے کو آمادہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان کی طرح پاکستان کے سامنے بھی سب سے بڑا مسئلہ غربت اور بے روزگاری کا ہے اور اگر غربت اور بیروزگاری اسی طرح قائم رہے گی تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف گروہوں کو آپس میں لڑانے اور ایک کو دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کا عمل بھی جاری رہے گا۔ اور باہمی خلفشار سے مختلف سیاسی گروہ جو سیاسی کم ہیں اور نفع خور اور مجرمانہ زیادہ ہیں، اپنا الو سیدھا کرتے رہیں گے۔ وہاں بھی بنیادی سوال قومی یک جہتی ہی کا ہے۔
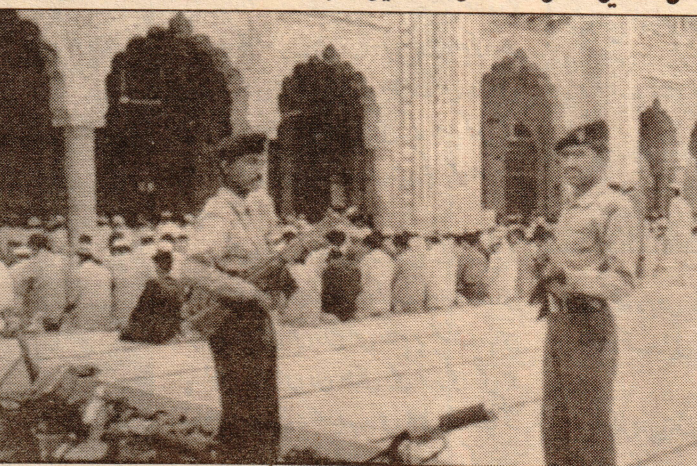
پاکستان سے جو مہاجر یا شرنارتھی ہندوستان آئے وہ یہاں ایسے رچ بس گئے کہ انہوں نے یہاں فرقہ واریت کا زہر پھیلایا بھی اور پھر اس سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا۔ یہ یاد دلانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ اڈوانی ہوں یا کھورانا، سب کے سب پاکستان سے بھاگ کر آئے ہوئے شرنارتھی ہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہاں سے بھاگ کر جو مہاجرین پاکستان پہنچے وہ وہاں کے معیار سے زیادہ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار تو تھے مگر ایک تو ان کے پیچھے کوئی گروہ نہ تھا دوسرے ان کی نسل اب ختم پر ہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ضیاء الحق تھے جن کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا۔ اب پاکستان کی سیاست میں غلبہ وہیں کے پرانے رہنے والوں کا ہے اور سیاسی کشمکش پنجاب اور سندھ کے درمیان ہے اور اس کشمکش میں جس کے جو ہتھیار ہاتھ میں آجائے اس کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔

اسی سلسلے کی کڑی ہے شیعہ سنی قضیہ جس کو اس لئے بھی ہوا دی جارہی ہے کہ بے نظیر بھٹو (گو عوام کی منتخب کردہ رہنما ہیں) مگر شیعہ ہیں اور ملک کی آبادی میں سنیوں کی اکثریت ہے اور مذہب کے نام پر بنے معاشرے اور حکومت میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ سرحد کے ادھر بھی ان واقعات وحادثات پر خوشی سے بغلیں بجانے والوں کی کمی نہیں جن میں خود حکومت ہند کے سربراہ بھی شامل ہیں۔ اپنی ناک سے آگے نہ دیکھنے والے یہ دور بین سیاست داں جو اپنے دیش اور دھرم کی دہائی دیتے ہیں اتنا بھی نہیں سوچتے کہ:

(1) پڑوسی چاہے کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں ان سے ہمیشہ کے لئے بگاڑ اچھا نہیں ہے ان سے کم سے کم ایک آنکھ ملنے کی ضرور رکھنی چاہئے۔ خاص طور پر آج کی دنیا میں جب علاقائیت کا دور دورہ ہے اور اسرائیل اور فلسطینی عرب بھی ایک دوسرے سے بہتر تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

(2) پاکستان کے موجودہ خلفشار کے پیچھے جو غیر ملکی عناصر کارفرما ہیں وہ کل ہمارے ملک کی طرف بھی نظر عنایت پھیر سکتے ہیں بلکہ گجرات اور مہاراشٹر کے انتخابات گواہ ہیں کہ پھیر چکے ہیں اور یہاں بھی اقلیت کے دور کی آمد آمد ہے۔

(3) اگر ہندوستان میں ہمیں جمہوریت عزیز ہے تو بے شک ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ ہمارے پڑوسی ملک میں آمرانہ جابرانہ یا کوئی اور من مانی حکومت قائم ہوجائے۔ جس سے بنٹنا ہمارے لئے کسی بڑے ملک کے وسیلے ہی سے ممکن ہوسکے گا۔ پاکستان کی موجودہ حکومت کے لئے نئے جھگڑے پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلے میں ہمارا رویہ مدبرانہ ہونا چاہئے۔

یہ سب تو ہوا مگر پاکستان کے اپنے دائرے میں اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ دراصل سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ نہ تو پاکستان کسی مضبوط عوامی تحریک کے نتیجے میں عمل میں آیا اور نہ پاکستان بننے کے بعد سے آج تک وہاں جمہوری بنیادوں پر عوامی تحریک کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا گیا۔ آج پاکستان جو کچھ ہو اس کا ہر باشندہ بلالحاظ مذہب وملت اور بلالحاظ علاقہ اور زبان کے اس کا ذمہ دار شہری ہے یہ اور بات ہے کہ اس کے آئین میں مذہبی بنیادوں کو بھی کہیں کہیں پیش نظر رکھا گیا ہے اور اعلیٰ مناصب صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کردیئے گئے ہیں۔

اب مسلمان ہوں یا کوئی اور۔ ہر گروہ ترقی کی راہوں پر آگے قدم بڑھاتا ہے تو اس میں افتراق اور اختلاف کم ہوتے جاتے ہیں اور اتحاد قومی کی لے تیز ہوتی جاتی ہے اور ان کے باہمی اختلافات کے باوجود ان کے درمیان ربط وآہنگ کا عمل بڑھتا جاتا ہے۔ زوال پذیر معاشرہ ہو تو یہ عمل اتحاد کی طرف اختلاف اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اختلاف کی طرف لے جاتا ہے۔

اب اگر پاکستانیوں کو آگے بڑھنا ہے تو انہیں ان چھوٹے چھوٹے اختلافات سے اوپر اٹھنا ہوگا۔ دقت یہ ہے کہ اس کام کو سرانجام دینے والے رہنماؤں اور سیاسی پارٹیوں کی کمی ہے جو اگر تمام پاکستانی نہ سہی کم سے کم تمام پاکستانی مسلمانوں ہی کے اتحاد اور اتفاق کی آواز بلند کرسکیں۔ نواز شریف پنجابیوں کے نمائندہ ہیں تو بے نظیر بھٹو سندھ کی، الطاف حسین مہاجروں کے۔ پھر پاکستان کی نمائندگی کون کرے اور اس لوٹ مار قتل خون کے سلسلے کو کون روکے؟ یہ سلسلہ صرف انتظامی اقدامات اور قانون کے ہاتھوں سے رکنے والا نہیں اس کے لئے ایک وسیع تر عوامی تحریک کی ضرورت ہے جو صرف پاکستان کو امن اور آشتی کا پیام دے باوجودیکہ نفرت کے الاؤ جگہ جگہ جل رہے ہیں مگر ایسے ہی موقعوں پر قوموں کو نئی رہبری کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم ہندو ہوں یا مسلمان۔ افریقی ہوں یا ایشیائی۔ یورپ کی غلامی سے آزادی کے بعد ہمیں دنیا کو اپنی بنیادی توانائی پر یقین اور اعتماد دلانا ہے اپنی کمزوریاں امریکا کے سر تھوپنے سے کام نہیں چلے گا۔ دیکھنا اور دکھانا یہ ہوگا کہ ہماری توانائی صدیوں کی غلامی کے بعد بھی قائم اور برقرار رہی ہے یا نہیں۔ آنے والی دنیا اسی توانائی کے بل پر آگے چل سکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ایشیا اور افریقہ کی قومیں جن میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ یہ ثابت کرسکے کہ وہ تہذیب اور تمدن کی ان برکتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کے لائق ہیں۔ جنہیں اب تک ہم نے مغربی کہہ کر اپنے سے دور رکھا ہے یا پھر ہم ہمیشہ کے لئے خود کو دنیا کی نظروں میں "غلام" ثابت کردیں گے۔

مغرب نے پاکستان۔ اور ہندوستان کو۔ مختلف قسم کی سوغاتیں فراہم کردی ہیں ان میں افغانستان کے "حریت پسندوں" کو فراہم کردہ ہتھیار بھی ہیں۔ کلاشنکوف کے خزانے بھی ہیں اور ہیروئن کی تجارت بھی ہے اور حکومتوں کو اتار پھینکنے اور نئے ماتھوں پر فرماں روائی کا تاج سجانے کے امکانات بھی (ہندوستان میں یہ ساز وسامان مختلف ہے اور اس کا احوال شیوسینا اور بی جے پی سے دریافت کیا جاسکتا ہے) سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان کے عوام ان دلدل میں گرنا پسند کریں گے جن سے ابھرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مذہب کے نام پر عوام بٹتے رہیں گے قبیلے اور مذہبی گروہ اور چھوٹے اور چھوٹے ہوتے رہیں گے۔ شیعہ سنی کے خون کا پیاسا ہوگا اور سنی شیعہ کے لہو کا اور اس کے بعد بریلوی وہابیوں کو قتل کرینگے اور اہلحدیث اہل قرآن کے لہو سے اپنی پیاس بجھائیں گے اور اسی طرح مہاجر غیر مہاجروں سے پنجابی سندھیوں سے اور قبائلی غیر قبائیلیوں سے دست وگریباں ہوتے رہیں گے۔ اور اس خلفشار کا فائدہ اٹھا کر اغیار ایک کو تخت سے اٹھا کر دوسرے کو بٹھاتے رہیں گے۔ آخر کب تک یہ کھیل جاری رہے گا۔

مدتوں پہلے کراچی ہی کی ایک محفل میں قاسم پیرزادہ کی زبانی یہ شعر سنا تھا۔ اس وقت اس کی معجز نمائی سے انکار ممکن نہ تھا آج کے حالات میں کچھ اور زیادہ اس کی معجز نمائی پر اعتبار ہے۔

تازہ بریدہ شاخ گل تجھ کو تو ہوش ہی نہیں
دیکھ ترے قریب سے رقص کناں صبا گئی

●

آحران مذہبی منافرتوں کا ذمہ دار کون

> نواز شریف پنجابیوں کے نمائندہ ہیں تو بے نظیر بھٹو سندھ کی، الطاف حسین مہاجروں کے۔ پھر پاکستان کی نمائندگی کون کرے اور اس لوٹ مار قتل خون کے سلسلے کو کون روکے؟

کیا چرار شریف کو دوسرا حضرت بل بنا دیا جائے گا؟

چرار شریف کی درگاہ پر مسلح فوجی

چرار شریف کی صورت حال دھماکہ خیز ہوتی جارہی ہے۔ مسلح افواج نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے اور وہاں کے باشندے اپنے مکانوں کو خالی کر کے دوسرے محفوظ مقامات پر پناہ لے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے اور تیس ہزار کی آبادی والے اس قصبے سے تادم تحریر سترفیصد لوگ انخلاء کر گئے ہیں۔ اگر چرار شریف خالی کرنے کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو چند دنوں میں یہ علاقہ عوام سے یکسر خالی ہو جائے گا اور یہاں صرف علاحدگی پسند جنگ جو اور مسلح افواج کے جوان ہی رہ جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑے خطرے کی بات ہوگی کیوں کہ اس صورت میں فوج چرار شریف پر چڑھائی کر سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں زبردست خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اطلاعات کے مطابق صوفی شاعر شیخ نورالدین کے مقبرے میں بہت سارے لوگ پناہ لیے ہوئے ہیں، سرکاری اطلاعات کے مطابق اس میں تقریباً ڈیڑھ سو جنگ جو چھپے ہوئے ہیں جبکہ دوسری اطلاعات کا کہنا ہے کہ وہاں عوام نے بھی پناہ لے رکھی ہے۔

در اصل شیخ نورالدین ایک صوفی شاعر تھے اور یہاں ان کا مقبرہ اور ایک خانقاہ بھی ہے۔ یہ مقبرہ ہندو مسلمان سبھی کے لئے مرکز عقیدت ہے۔ ہندو بھی یہاں منتیں مانگنے آتے ہیں اور مسلمان بھی آکر عبادت کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مسلح دستوں کے مظالم سے نجات پانے کے لئے عوام نے اس خانقاہ میں پناہ لے رکھی ہے جبکہ فوج اور سرکاری ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کے بجائے جنگ جوؤں نے مقبرہ کو اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے اور اگر عوام ہیں بھی تو وہ اپنی مرضی سے نہیں جنگ جوؤں کے دباؤ میں وہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا جارہا کہ علاقے کے لوگ جب یہاں سے بھاگتے ہیں تو جنگ جو انہیں کچھ نہیں کہتے البتہ یہ حکم ضرور دیتے ہیں کہ وہ اپنے مکانوں کو مقفل نہ کریں۔

سرکاری ذرائع کے مطابق چرار شریف پر افغان دہشت گردوں کا قبضہ ہے اور ان سب کا لیڈر مست گل ہے جس کا تعلق حزب المجاہدین سے ہے۔ مسلح افواج کی کوشش چرار شریف کو ان سے آزاد کرانا ہے لیکن بقول سرکاری ذرائع وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے کترا رہی ہے۔ کیوں کہ اگر مزار کی بے حرمتی ہوتی ہے تو اس کے خلاف زبردست عوامی رد عمل پیدا ہوگا اور ہندو مسلم سبھی فوج کی کارروائی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن حکومت اس سے بھی خائف ہے کہ کہیں جنگ جو اسے درگاہ حضرت بل نہ بنا دیں جبکہ عوام کو خدشہ ہے کہ فوج خود اسے درگاہ حضرت بل بنا دیگی، کیوں کہ وہ چرار شریف کی آزادی کے نام پر کوئی بھی کارروائی کر سکتی ہے اور اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

تقریباً ایک ہفتہ کی ناکہ بندی کے بعد اخبار نویسوں کو چرار شریف کا دورہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ بڈگام ضلع میں واقع اس مقام پر مختلف سیاسی پارٹیوں نے اس دن ہڑتال بھی کر رکھی تھی جو زبردست پیمانے پر کامیاب رہی۔ قابل غور ہے کہ فوج نے اسی دن ہی کیوں اخبار نویسوں کو دورہ کرنے کی اجازت دی اس سے قبل کیوں نہیں؟ شاید فوج اس سے یہ دیکھانا چاہ رہی ہو کہ یہاں جنگ جوؤں کی حکومت ہے اور یہی لوگ امن و امان کو خراب کر رہے ہیں۔ ہڑتال کے دن بھی لوگوں کے فرار کا سلسلہ جاری رہا۔

شمیمہ نام کی ایک خاتون اپنے نومولود پوتے کو گود میں لیے اپنا مکان خالی کر کے جارہی تھی کہ مسلح افواج نے اسے اور اس کی تین بیٹیوں کو روکنے اور اپنے گھر واپس جانے کی کوشش کی لیکن شمیمہ جو انتہائی پریشان اور بد حال تھی کسی بھی قیمت پر واپس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ میں دل کی مریضہ ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے تشویشناک حالات نہیں دیکھے آپ لوگ مجھے تنہا چھوڑ دیجیے میں کچھ دیر سکون کا سانس لینا چاہتی ہوں۔ بعد میں اس نے کہا کہ وہ واپس نہیں ہوگی کیوں کہ وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ چرار شریف سے باہر اس وقت تک رہیگی جب تک کہ یہ بحران ٹل نہ جائے۔

> مجموعی طور پر چرار شریف کے حالات انتہائی دھماکہ خیز ہیں۔ حکومت اور فوج کی طرف سے بار بار اعلان ہو رہا ہے کہ درگاہ پر چڑھائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن درگاہ کے محاصرے اور سابقہ تجربات نے لوگوں کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

انسپکٹر جنرل آف پولس ایس ایس علی بھی کہتے ہیں کہ قصبہ میں ڈیڑھ سو کرایے کے جنگجو ہیں جو روپوش ہیں۔ جبکہ درگاہ میں موجود ایک نوجوان ٹیپو سلطان جسے اخبار والے جنگجو بتاتے ہیں کا کہنا ہے کہ یہاں غیر ملکی نہیں ہیں وہ تو جنگل میں رہتے ہیں۔ ٹیپو سلطان اور صاحب نامی دو نوجوانوں نے اخبار نویسوں کو پیش کش کی کہ وہ درگاہ میں چل کر دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں جنگ جو چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خانقاہ کے امام کا بھی یہی کہنا ہے کہ اندر جنگ جو نہیں ہیں۔

میجر مست گل نے جنہیں افغان باشندہ بتایا جاتا ہے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستانی افواج سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ اگر فوج حملہ کرے گی تو ہم اس سے آخری دم تک لڑیں گے اور اللہ کے فضل سے فتح ہماری ہوگی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی تعداد بتانے سے تو انکار کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ ہم ایک سال تک جنگ کر سکتے ہیں اور ہندوستانی فوج ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مست گل نے خوف و ہراس پیدا کرنے کا الزام بھی ہندوستانی فوج پر لگایا۔ اس نے کہا کہ ہم یہاں اللہ کی حکومت قائم کرنے آئے ہیں اور کشمیر کو آزاد کرا کے یہاں اللہ کی حکومت قائم کر کے ہی ہم جائیں گے۔

میجر مست گل

شاید چرار شریف سے لوگوں کے انخلاء کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں بجلی پانی اور طبی سہولیات کا معقول انتظام نہیں ہے۔ خواتین کا کہنا ہے کہ ہمیں مجبوراً حاملہ خواتین کو بھی اپنے ساتھ لے جانا پڑ رہا ہے کیوں کہ یہاں طبی سہولیات نہ ہونے کے سبب زبردست پریشانی ہے۔ کچھ لوگوں نے اخبار نویسوں سے یہ بھی شکایت کی کہ کئی دنوں کے بعد آج بجلی اور پانی کی سہولیات دستیاب ہوئی ہیں۔

سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ جنگ جوؤں نے خود ہی بجلی پانی کی لائنیں کاٹ دی ہیں تاکہ یہ علاقہ خالی ہو جائے جبکہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ اخبار نویسوں کو دورے کی اجازت دی گئی تھی اس لئے انتظامیہ نے بجلی پانی کی سہولیات کا انتظام کیا۔ چرار شریف کے نواح میں رہنے والوں نے بھی ضروری سہولیات کے فقدان کی شکایت کی۔

مجموعی طور پر چرار شریف کے حالات انتہائی دھماکہ خیز ہیں۔ حکومت اور فوج کی طرف سے بار بار اعلان ہو رہا ہے کہ درگاہ پر چڑھائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن درگاہ کے محاصرے اور سابقہ تجربات نے لوگوں کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تادم تحریر حالات قابو میں ہیں لیکن کل کیا ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ صورت حال بہت ہی غیر یقینی ہے اور ممکن ہے کہ حکومت اور جنگ جوؤں کی حرکتیں چرار شریف کو بھی حضرت بل بنا دیں۔ ●

پرتشدد فلموں نے مغربی معاشرے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا

جب انسان کے دل سے یہ احساس ختم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ یا یہ کہ اس کی زندگی موت سے بدتر ہو سکتی ہے تو پھر وہ کچھ بھی کر گذرے تو تعجب کی بات نہیں۔ اس احساس کا فقدان ہی آج دنیا کے تمام معاشروں میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی بے چینی اور انتشار کا اصل سبب ہے۔ نوجوانوں کے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ صلاحیت نام کی چیز ان میں کہیں نہیں ہے۔ خاندان کا ڈھانچہ بگڑ چکا ہے اور آج کسی نوجوان کو خود سے یہ سوال کرنے کا خیال بھی نہیں آتا کہ وہ واقعی انسان کی حیثیت سے زندہ ہے۔ فرانس میں تہلکہ مچانے والے ایک مجرمانہ واقعے نے اس خدشے کو اور بھی شدید کر دیا ہے۔ اس ڈرامے میں ملوث دو کردار ہیں ایک کالج کی 19 سالہ طالبہ اور اس کا 22 سالہ دوست جنہوں نے جرائم پر مبنی ایک امریکی فلم دیکھ کر اپنا پلان بنایا تھا۔ ایک دن وہ دونوں ڈھاٹا باندھ کر پستول لئے ہوئے باہر نکلے تھے کہ انہیں جاتے دیکھ کر پولس والوں کی نظر پڑی۔ ان پر شک ہوا تو ان سے رکنے کے لئے کہا گیا۔ رکنے کے بجائے انہوں نے اور تیز رفتاری دکھائی اور اسی اثناء میں ریوالور کی نوک پر ایک ٹیکسی کو رکوا کر سوار ہو گئے۔ اب باقاعدہ تعاقب اور مقابلہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس کارروائی میں لڑکی کا دوست تین پولس والے اور خود ٹیکسی ڈرائیور فوت ہو گئے۔ لڑکی کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ جب پولس نے اس کے کمرے کی تلاشی لی تو وہاں سے انہیں تشدد، قتل اور مختلف جرائم سے متعلق فلمیں ملیں۔ کمرے میں اس مخصوص امریکی فلم کے منظر کا بڑا "بلو اپ" بھی تھا جسے دیکھ کر انہیں جرم کی ترغیب ملی تھی۔ لڑکی کے حالات زندگی کی تفتیش کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک معزز خاندان کی فرد ہے اور تشدد کی طرف کبھی اس کا میلان ہی نہیں تھا، نہ ہی کسی خراب سیاست میں شریک تھی اور نہ ہی ایسے لباس پہنتی تھی جس سے بے راہ روی کا شبہ کیا جا سکے چہ جائیکہ اس نے ڈھاٹا باندھ لیا!

سینما کی خرابی یہ ہے کہ وہ حقیقت سے کہیں زیادہ وہم کا پرتو ہے اور جب یہ وہم عوام کی زندگیوں میں سرایت کرنے لگتا ہے تو ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

بقیہ: بنارس کی گیان واپی مسجد

ہے۔ البتہ اس معاملے کو گرمانے کی کوشش ضرور کی گئی۔ بنارس کے لوگوں کا عام طور پر یہ نظریہ ہے کہ جب 1777 میں اندور کی مہارانی اہلیا بائی ہولکر نے گیان واپی مسجد کو گرا کر مندر کی پھر سے تعمیر کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت وہاں کے پنڈتوں نے اس کی پرزور مخالفت کی تھی تو ایسی صورتحال میں 1995 میں اس معاملے کو اٹھانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہی اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ تحریک آگے نہیں بڑھے گی یا اس میں گرمی نہیں پیدا ہوگی۔ ابھی بی جے پی کے کاشی آندلون میں کودنے کا وقت نہیں آیا ہے البتہ ممنوعہ وشو ہندو پریشد نے ہندو سنگم کے نئے نام سے اس قدیم شہر میں لوگوں کو اکٹھا کر کے خطرے کی گھنٹی بجا دی ہے۔ اس نے اجودھیا کی مانند یہاں بھی نئے نعرے گھڑے ہیں اور بنارس کی تنگ و تاریک گلیوں میں انہیں اچھال کر ہندوؤں میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس تنظیم نے پہلے ہی ملک کے لاکھوں ہندوؤں کو گنگا جمنا اور سرجو ندی کا پانی اور وہاں کی مٹی تبرک کے طور پر دے کر ایک جذباتی ماحول بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سردست بنارس میں تو کچھ نہیں ہوا لیکن جب بی جے پی اس میں کودے گی تو یہاں بھی خطرناک ماحول بن جائے گا۔ ●

سڑکوں پر نماز نہیں پڑھنے دی جائے گی شہروں کے مسلم نام بدل دیئے جائیں گے

کیا بال ٹھاکرے بمبئی کے مسلمانوں کو نکال پھینکیں گے؟

رپورٹ: سہیل انجم

مہاراشٹر کے فسطائی لیڈر بال ٹھاکرے کا خواب پورا ہوگیا۔ ان کی پارٹی شیوسینا مہاراشٹر میں برسراقتدار آگئی۔ کل تک سینا بھون پر لہرانے والا بھگوا جھنڈا اب مہاراشٹر اسمبلی پر لہرانے لگا ہے۔ یقیناً یہ فسطائی طاقتوں کی زبردست جیت ہے، جس سے ان کے حوصلے بلند ہوگئے ہیں اور بی جے پی کے لیڈر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اب ایک بار پھر ان کے دن واپس آرہے ہیں۔ مہاراشٹر میں بھگوا سرکار بنانے کے بعد پارلیمنٹ پر بھگوا لہرانا ان کے لئے زیادہ آسان محسوس ہونے لگا ہے۔ ان طاقتوں کو خصوصاً اڈوانی اور ٹھاکرے کو مہاراشٹر ودھان سبھا سے دلی کی پارلیمنٹ بالکل صاف اور واضح نظر آنے لگی ہے۔ وہ یہ محسوس اور اظہار کرنے لگے ہیں کہ اب دلی دور نہیں ہے۔ مہاراشٹر کی حکومت پر قبضہ کرنا شیوسینا اور بی جے پی کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کہ انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا ہے۔ بلاشبہ یہ ان دونوں پارٹیوں بالخصوص شیوسینا کی تاریخ کا زریں دور ہے۔ یہ ایک ایسے خواب کا شرمندہ تعبیر ہونا ہے جو تقریباً ناممکن تھا۔

کہنے کو تو منوہر جوشی مہاراشٹر کے وزیر اعلی اور گوپی ناتھ منڈے نائب وزیر اعلی ہیں لیکن یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اصل وزیر اعلی بال ٹھاکرے ہی ہیں۔ وہ وزیر اعلی بھی ہیں اور نائب وزیر اعلی بھی اور ایک طرح سے وزارتی کونسل بھی ہیں۔ بظاہر مہاراشٹر حکومت میں کئی وزراء ہیں اور الگ الگ محکمے الگ الگ ممبران کو سونپے گئے ہیں لیکن عملی طور پر ان تمام محکموں اور وزارتوں کا مرکز بال ٹھاکرے کا بھگوا دامن ہے۔ وزیروں کے سروں پر وزارتوں کی دستاریں مزین ہیں اور وہ سرخ بتیوں والی گاڑیاں لے کر گھوم رہے ہیں لیکن فیصلے سینا بھون سے لئے جارہے ہیں۔ ٹھاکرے نے کہا بھی ہے کہ وہ "ریموٹ کنٹرول وزیر اعلی" ہیں یعنی عملی طور پر وزیر اعلی وہی ہیں اور نہ صرف وزیر اعلی کی بلکہ تمام وزراء کی چابی انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ بساط وزارت کے ارد گرد یوں تو کئی کھلاڑی ہیں لیکن اصل کھیل بال ٹھاکرے کھیل رہے ہیں اور تمام مہرے انہیں کے ہاتھ میں ہیں۔ یوں بھی فسطائی جماعت میں ڈکٹیٹر شپ ہی چلتی ہے اور یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک آمریت پسند جماعت جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر ملک کی صنعتی راجدھانی پر حکومت کررہی ہے۔

بہرحال یہ دن کی روشنی کی مانند اٹل اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مہاراشٹر میں شیوسینا کا سورج نصف النہار پر ہے۔ اس کی جو بھی وجوہات ہوں۔ کانگریس اس کی ذمہ دار ہو یا کانگریس سے مسلمانوں کی ناراضگی نے شیوسینا کا راستہ ہموار کیا ہو، سردست اس سے بحث نہیں ہے۔ جائزہ اس کا لینا ہے کہ بال ٹھاکرے کی حکومت بننے کے بعد بمبئی کے مسلمان کیا سوچتے ہیں اور مسلمانوں کے تعلق سے ٹھاکرے حکومت کے اقدامات کے امکانات کیا ہیں۔ مسلمانوں کو ہرا سانپ کہہ کر گالیاں دینے والا انہیں پاکستان بھیجنے کی دھمکی دینے والا اور ان کی ملکی وفاداری پر سوالیہ نشان کھڑا کرنے والا لیڈر آج برسراقتدار ہے اور ابھی تک بالواسطہ طور پر بال ٹھاکرے کے رحم وکرم پر جینے والے مسلمان اب کھلے اور واضح طور پر ان کے رحم وکرم پر جینے پر مجبور ہیں۔

الیکشن میں مسلمانوں کا ایک ہی مقصد تھا کانگریس کو شکست دینا۔ انہوں نے اس پر گہرائی سے غور نہیں کیا تھا کہ اس کے نتیجے میں کون سی جماعت برسراقتدار آئے گی۔ جو حالات تھے ان میں نتائج پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ اگر مسلمان انجام پر غور کرتے تو وہ کانگریس کو ہرانے میں کامیاب ہی نہیں ہوتے اور کانگریس کو شکست دینا وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اب جب کہ شیوسینا اور بی جے پی برسراقتدار آگئی ہیں تو کیا مسلمانوں میں خوف وہراس کی لہر پیدا ہوگئی ہے یا پھر انہیں یک گونہ سکون حاصل ہوا ہے کہ چلو مقابل میں ایک کھلا ہوا دشمن ہے اور دوست نما دشمن سے نجات مل گئی ہے۔ اخبارات کی رپورٹوں اور دفتر ملی ٹائمز سے بمبئی کے سرکردہ مسلمانوں سے ٹیلی فونک گفتگو سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بمبئی کے مسلمانوں میں دونوں قسم کے رجحانات ہیں اور انہوں نے دو طرح کا ردعمل ظاہر کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب میونسپل کارپوریشن میں شیوسینا برسراقتدار تھی تو اس نے مسلمانوں کے تئیں بہت زیادہ متعصبانہ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور حکومت میں آنے کے بعد چونکہ ذمہ داری آن پڑتی ہے اس لئے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے، اس لئے یہ سوچنا کہ مسلمانوں پر خطرے کی تلوار لٹک گئی ہے مبنی برانصاف نہیں ہوگا۔ کچھ لوگوں کو اس پر بھی افسوس ہے کہ بمبئی میں کانگریس کو صرف ایک نشست ملی ہے لیکن اظہار افسوس کرنے والی ایک اردو ٹیچر محترمہ مسرت خان یہ بھی کہتی ہیں کہ کانگریس کو اس سے یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر وہ جیت نہیں سکتی۔ بمبئی فسادات کے دوران مسرت خان اپنی بہنوں کے ساتھ بمبئی ہی میں رہ رہی تھیں انہیں شیوسینا کے غنڈوں کا خوف بھی تھا لیکن وہ فسادات کا ذمہ دار شیوسینا کو

باقی صفحہ 14 پر

بال ٹھاکرے اور اڈوانی: اقتدار کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

وزیر اعلی منوہر جوشی: اب سڑکوں پر نماز نہیں ہوگی

ریاستی انتخابات میں شکست کے بعد

کانگریس موت وزیست کی کشمکش میں

کانگریس دھیرے دھیرے تہی دست ہوتی جا رہی ہے۔ حالیہ اسمبلی انتخابات میں مزید دو ریاستیں اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔ آندھرا پردیش اور کرناٹک کے بعد اب مہاراشٹر اور گجرات بھی اس سے چھن گئے ہیں۔ یوں تو مذکورہ چاروں ریاستیں بڑی اور انتہائی اہمیت کی حامل ہیں لیکن موخر الذکر دونوں ریاستیں ملکی اقتصادیات کی ریڑھ کی ہڈی ہیں مرکز میں عام طور پر اسی پارٹی کی حکومت بنتی ہے جو مذکورہ ریاستوں میں برسراقتدار ہو۔ اور ان دونوں میں شیوسینا اور بی جے پی کی حکومتیں قائم ہوگئی ہیں۔ مہاراشٹر میں منوہر جوشی اور گجرات میں کیشو بھائی پٹیل وزیر اعلی بنائے گئے ہیں۔ البتہ اڑیسہ میں اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آگیا ہے اور جے بی پٹنائک کو وزیر اعلی بنایا گیا ہے۔

کانگریس کی شکست وریخت کا سلسلہ دراصل بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہی سے چل رہا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمان کانگریس پارٹی کا ووٹ بنک رہے ہیں اور افسوسناک امر یہ ہے کہ کانگریس نے مسلمانوں کو ووٹ بنک سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود مسلمان کسی دوسرے متبادل کے نہ ہونے کے سبب کانگریس کو ووٹ دیتے آرہے تھے لیکن بابری مسجد کے سلسلے میں کانگریس نے جو گھناؤنا رول ادا کیا اس نے مسلمانوں کو کانگریس سے متنفر کر دیا اور مسلمانوں نے کانگریس کو شکست دینے کا تہیہ کرلیا۔ نتیجے کے طور پر پہلے آندھرا پردیش اور کرناٹک سے اسے ہاتھ دھونا پڑا اور پھر مہاراشٹر اور گجرات سے۔ اس وقت کانگریس کی پوزیشن یہ ہے کہ ملک کی 25 ریاستوں میں سے وہ محض 12 ریاستوں میں برسراقتدار ہے جن میں صرف 6 ریاستیں بڑی ہیں باقی سب چھوٹی ہیں اور سیاسی سطح پر کسی اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ جو بڑی ریاستیں اس کے ہاتھ میں ہیں ان میں مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب، اڑیسہ، آسام اور کیرالا ہیں۔ اڑیسہ میں ابھی حالیہ الیکشن کے بعد کانگریس برسراقتدار آئی ہے اور کیرالا میں وہ بحران کی شکار ہے۔

حالیہ انتخابی نتائج کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس اپنی شکست کی خود ذمہ دار ہے۔ اندرونی کشمکش، قیادت کے خلاف بڑے پیمانے

باقی صفحہ 6 پر

سربیائی درندے عورتوں کے جسم کو میدان جنگ کی طرح روند رہے ہیں

شیطان صفت فوجیوں نے ایٹمی اسلحوں کی جگہ عصمت دری کو ہتھیار بنا لیا ہے

معروف امریکی صحافی گریس ہال سیل کے مشاہدات

سربیائی فوجیوں کی مجرمانہ حرکات نے بعض اعتبارات سے دوسری عالمی جنگ کے دوران نازی جرمنی اور کمیونسٹ روس کے ہیبت ناک مظالم کو بھی شرما دیا ہے۔ ایٹمی بم اور جرثوماتی ہتھیاروں کے اس دور میں انہوں نے عصمت دری کو ہتھیار کے طور پر زیادہ مہیب شکل دی ہے۔ اس سے پہلے کسی بھی جنگ میں فوجی افسران کی طرف سے سپاہیوں کے اجتماعی عصمت دری کے ارتکاب کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تھی۔ لیکن سربیائیوں نے اپنی حریف قوم کی کمر توڑنے کی غرض سے یہ کام بھی کر دکھایا ہے۔ اجتماعی عصمت دری کے علاوہ سربیوں کے ہاتھوں چھ سات سال کی نابالغ بچیوں پر جنسی حملے کے متعدد واقعات پہلی بار کسی جنگ میں رونما ہوئے ہیں۔ یہ عام حقیقت ہے کہ جنگ اپنے دامن میں عوام کے لئے بہت سے مظالم اور مصیبتیں لے کر آتی ہے جس کی شہادت ویت نام، لبنان اور کوریا کے واقعات دے چکے ہیں۔ لیکن ایسی کوئی نظیر مشکل سے ہی ملے گی جب فوجی افسروں نے سپاہیوں کی پیٹھ ٹھونکی ہو کہ وہ بے بس عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں اور انہیں زبردستی حاملہ کریں۔

بے شک سیاسی مقاصد کے تحت عصمت دری کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے جس میں مقامی عورتوں کو غالب گروہ یا قوم کی نسل کی افزائش کا جبرا ذریعہ بنایا جاتا ہے جس کی ایک سے زائد مثالیں قدیم و جدید تاریخ دونوں میں مل جائیں گی مگر سربیاؤں کے لئے عصمت دری ایک ایسا حربہ بن گیا جس کے استعمال کی گویا انہیں حکومتی سطح پر کھلی آزادی دیدی گئی کیونکہ اپنے مقابل نبرد آزما قوم کی عزت و عصمت کو کچل ڈالنے کا اس سے موثر ذریعہ شاید کچھ اور ہو نہیں سکتا تھا۔

عرب نیوز کی نامہ نگار گریس ہال سیل کے مطابق انہوں نے ایسے کئی واقعات سنے جن میں کسی بوسنیائی مسلمان کو اپنی بیوی بیٹی یا ماں کی سربیائی درندوں کے ہاتھوں بے آبروئی کا اذیت ناک منظر اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنا پڑا۔ انہوں نے ان ماؤں کی بھی داستان الم سنی جن کی بیٹیوں کی عصمت دری ان کے روبرو کی گئی۔ ایسی بھی مثالیں ہیں جہاں ماں اور بیٹی دونوں کے ساتھ

پناہ گزیں بوسنیائی خواتین، در بدر بھٹکنے پر مجبور

بیک وقت یکساں وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ سربیائی بربریت نے معصومیت اور ضعیفی کے امتیازات کی طرف سے بھی یکسر آنکھیں بند کر لیں۔ عورتوں اور بچیوں کے تئیں اختیار کردہ سربیائی حکمت عملی کی تین قسمیں گنائی جا سکتی ہیں جن میں پہلے طریقہ کار کے تحت بچیوں اور چھوٹے بچوں کے جنسی اعضاء کو مسخ کر دیا گیا۔ ایک عالمی رفاہی جماعت "فزیشنز فار پیس" کا بیان ہے کہ ان کے علم میں ایسے بھی واقعات آئے ہیں کہ تین سال کی بچیوں کو جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ گریس ہال سیل نے جن عورتوں سے انٹرویو لیا ان میں ماتا نام کی 56 سال کی ایک عورت بھی تھی جسے 150 عورتوں کے ساتھ ایک ایذا رسانی کیمپ میں سربیاؤں نے اسیر کر رکھا تھا۔ خون روتی ہوئی آنکھوں والی اس عورت نے بتایا کہ وہ سربیاؤں کو چھ اور آٹھ سال کی بچیوں کی عصمت دری کرتے ہوئے دیکھنے کی عینی شاہد ہے۔ وہ اور اس کے ساتھ کے لوگ اگر ذرا بھی احتجاج کرتے تو ان کے سر دھڑ سے الگ کر دیے جاتے۔ 30 سالہ دوشیزہ ایدا نے ایک واقعہ اس طرح نقل کیا کہ ان کے والد کا ایک ڈاکٹر دوست جو ان کے گھر آیا تھا آہوں اور کراہوں کے درمیان یہ بتایا کہ اس نے سربیائی درندگی کی بھینٹ چڑھنے والی ایک آٹھ سالہ لڑکی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی جس کی شرمگاہ بری طرح لہولہان تھی۔ اس کی زندگی سے مایوس ہو کر اس نے زہر کا انجکشن دے کر اسے اس اذیت سے نجات دلادی۔

> خون روتی ہوئی آنکھوں والی اس عورت نے بتایا کہ وہ سربیاؤں کو چھ اور آٹھ سال کی بچیوں کی عصمت دری کرتے ہوئے دیکھنے کی عینی شاہد ہے۔ وہ اور اس کے ساتھ کے لوگ اگر ذرا بھی احتجاج کرتے تو ان کے سر دھڑ سے الگ کر دیے جاتے۔

ایک 30 سالہ بوسنیائی مسلمان نے نامہ نگار مذکورہ کو بتایا کہ سربیاؤں نے اس کے گاؤں پر حملہ کر کے تقریباً دو سو مردوں کو اور اسے گرفتار کر لیا اور ایذا رسانی کے ایک کیمپ میں بھجوا دیا۔ اسی کیمپ میں ان کے گاؤں کا ایک ڈاکٹر بھی تھا جسے سربیائی اپنی جنسی ہوس بننے والی ایک دس سالہ لڑکی کی شرمگاہ میں ٹانکے لگانے پر مجبور کر رہے تھے۔ خون میں لت پت بچی کو دیکھ کر ڈاکٹر یہ بھول گیا کہ سربیاؤں کی قید میں ہے اور ان بھیڑیوں کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ حکم عدولی کی سزا میں اس ڈاکٹر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عورتوں کو بوسنیائی مسلمانوں کی نسل کشی کے حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یعنی عورتوں کو ان کے شوہروں یا متوقع شوہروں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ ایذا رسانی کے کیمپوں میں پڑے ہوئے مسلمان مرد اپنی موت کی ساعت کا انتظار کرتے ہیں۔ اور اس دوران بعض عورتوں کی آبروریزی یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بطن سے مسلمان نہیں بلکہ ننھے سربیائی سپاہی پیدا کریں۔ چھبیس سالہ زیبا نے خود اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایذا رسانی کے کیمپوں میں عصمت دری دن رات کا معمول ہے۔

جہاں ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھیں کہ تم لوگ کتنے سربیائی سپاہی پیدا کر سکتی ہو۔ یہی نہیں بلکہ ایک عورت نے یہ بھی اقرار کیا کہ پچاس سربیائی سپاہیوں نے اس کی اجتماعی آبروریزی کی تھی۔ ایسے واقعات کی کمی نہیں۔

سربیائی بربریت کے ان دو نمونوں سے ایک تیسرے حربے کی نشاندہی ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کے نزدیک عورتوں کے جسم میدان جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں جسے روند کر اور پامال کر کے بوسنیائی مسلمانوں کو روحانی اذیت دے کر ان کی غیرت کو للکار رہے ہیں اور جیسا کہ یوروپی اتحاد کی ایک تحقیقی کمیٹی نے نتیجہ نکالا ہے کہ آبروریزی سزا اور ایذا رسانی کے دائرہ کار کا ایک اہم جزء ہے۔ اس کمیٹی کا کہنا ہے کہ بوسنیائی عورتوں کی بے حرمتی اور عصمت دری کوئی امکانی حادثہ نہیں ہے بلکہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے اور ان پر اپنی قوت کا رعب طاری کرنے کی غرض سے کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ شاید کسی شخص کی اس سے زیادہ بے بسی ولاچاری اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ماں، بیٹی یا بیوی کی عزت و ناموس کو پامال ہوتے دیکھتا رہے اور کچھ کر نہ سکے۔

صحافی گریس ہال سیل کی گفتگو نیو جرسی کی جوڈی ڈرائیل نام کی ایک نرس سے ہوئی۔ ان کا زیادہ تر وقت سربیائی مظالم کی زد پر آنے والے افراد کی تیمارداری میں گزرتا ہے ان کا خیال ہے کہ سربیائی سپاہی بوسنیائی عورتوں کو عصمت دری کے کیمپوں میں اس لئے مقید رکھتے ہیں کہ انہیں بوسنیائی نسل کی افزائش سے روک سکیں اور اکثر ان کیمپوں میں ہی ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

واشنگٹن ڈی سی کے بروکنگس انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ فیلو سوسن وڈورڈ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جنگ میں عورتوں کی آبروریزی کوئی نئی بات تو نہیں ہے البتہ بوسنیائی مسلمان عورتوں کی بے حرمتی ایک خاص مقصد کے تحت کی گئی کہ ان کی نسل کے بچوں کی پیدائش سے انہیں روک کر دوسرے غالب گروہ کی نسل کے بچے پیدا کرنے پر انہیں مجبور کیا جائے۔ اعداد و شمار شاہد ہیں کہ اب تک بوسنیا میں پچاس ہزار عورتیں عصمت دری کے بہیمانہ جرم کا شکار ہو چکی ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف خود بوسنیائی نائب صدر اجپ گانک نے کیا کہ حکومت کی سرپرستی میں عورتوں کو جنگی ہتھیار کے طور پر کمیونسٹوں اور ہٹلر نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔

انگریزی سے تلخیص و ترجمہ

بقیہ زندگی اور موت کی کشمکش میں

پر ناراضگی اور کرپشن و بدعنوانی نے کانگریس کو تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا ہے۔ نرسمہا راؤ کے ہاتھ میں کانگریس کی زمام قیادت آنے کے بعد ہی سے وہ زوال کی طرف گامزن ہے۔ یوں تو راؤ کو بساط سیاست کا ماہر کھلاڑی تصور کیا جاتا ہے اور جب 1993 میں ریاستی انتخابات ہوئے تھے اور بی جے پی اپنی سابقہ چار میں سے تین ریاستوں میں ہار گئی تھی اور مدھیہ پردیش میں کانگریس کی حکومت بن گئی تھی تو بڑے بڑے سیاسی پنڈت بھی راؤ کی سیاسی دور اندیشی اور فہم و فراست پر مہر تصدیق ثبت کر رہے تھے لیکن وہ بھرم جلد ہی ٹوٹ گیا اور دوسرے دور کے الیکشن میں راؤ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا بت پاش پاش ہو گیا۔

اب زبردست شکست کے بعد کانگریس کے ایک حلقے میں خود احتسابی کا دور شروع ہو گیا اور یہ حلقہ راؤ کی قیادت کے خلاف بگل بجانے کی تیاری کرنے لگا لیکن بغاوت صرف ارجن سنگھ نے کی اور انہیں اس کی پاداش میں پارٹی سے نکال دیا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس اقدام کو کانگریس برداشت نہیں کر پائیگی اور وہ منقسم ہو جائے گی لیکن ہوا کچھ نہیں۔ نہ ہی کانگریس ٹوٹی اور نہ راؤ کے ہاتھوں سے زمام قیادت چھنی۔ البتہ کچھ لوگ اس کوشش میں ضرور ہیں کہ راؤ کو کسی طرح کمزور کر کے ان کے سر سے اعلیٰ کمان کی دستار اتار لیں۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ تیسرے راؤنڈ کے الیکشن میں اگر کانگریس ہار جاتی ہے تو راؤ کی قیادت کو للکارنے کا عمل تیز ہو جائے گا اور انہیں مجبور ہو کر پارٹی ساتھیوں کی خواہش کے آگے جھکنا پڑیگا۔

اس مہم کو مزید تیز کرنے کے لئے کانگریس کے ایک رکن پارلیمنٹ اسلم شیر خان نے انتخابی نتائج کے منظر عام پر آنے کے فوراً بعد اپنی رہائش گاہ پر کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کی ایک اہم میٹنگ طلب کی تھی جس میں کانگریس کی شکست کے اسباب کی تلاش اور پارٹی کو متحد و مضبوط کرنے کی حکمت عملی پر غور کرنا تھا۔ لیکن ایک تو اس میں حسب توقع کم لوگوں نے شرکت کی دوسرے یہ میٹنگ طوفان بدتمیزی اور گالم گلوچ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ صرف پی آر کمار منگلم اور اسلم شیر خاں نے کھل کر راؤ کی قیادت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ میٹنگ میں راؤ حامی نعرے بھی لگے اور کچھ لوگوں نے سونیا سے سیاست میں آنے اور کانگریس پارٹی کو بچانے کی اپیل بھی کی۔ لیکن نہ تو راؤ کی سیاسی صحت پر کوئی اثر پڑا اور نہ ہی سونیا اپنے حجرے (دس جن پتھ) سے باہر نکلیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں پر ضابطہ شکنی اور پارٹی مخالف سرگرمیوں کا الزام ضرور لگا جو اس میں شریک ہوئے۔ راؤ کے حامیوں اور وفاداروں میں سے کچھ کا خیال ہے کہ میٹنگ میں شریک ہونے والوں خصوصاً اسلم شیر خاں اور کمار منگلم کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ لیکن ایک حلقہ اس کے حق میں نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ کارروائی کر کے خواہ مخواہ میٹنگ کو اہمیت دینا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ ویسے راؤ کے کام کرنے کا جو طریقہ کار ہے اس کے پیش نظر ایسا نہیں لگتا کہ وہ کوئی کارروائی کریں گے۔

جہاں تک کانگریس کے مستقبل کا سوال ہے تو یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وہ تیزی سے زوال پذیر ہے اور اسکا مستقبل روشن نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کے ذمہ دار نرسمہا راؤ ہی ہیں انہوں نے پہلے شمالی ہندوستان میں کانگریس کی بنیاد کمزور کی اس کے بعد جنوب میں انکے اقدامات کے سبب وہ درگور ہو گئی۔ حالانکہ راؤ خود جنوب سے تعلق رکھتے ہیں اور ریاستی انتخابات میں انہوں نے عوام کے سامنے اس نسبت کے تعلق سے "بھیک" بھی مانگی تھی لیکن اس سے کسی کا دل نہیں پسیجا اور کانگریس آندھرا اور کرناٹک میں دفن ہو گئی۔ اب مغرب میں بھی کانگریس کا جنازہ نکل گیا ہے۔ 1996 میں عام انتخابات ہونے ہیں اگر اس سے قبل ریاستی انتخابات کے دو ایک راؤنڈ اور چلتے تو ممکن ہے کہ بقیہ ریاستوں میں بھی کانگریس ختم ہو جائی اور کانگریس کی حکومت مرکز تک سمٹ کر رہ جاتی۔ دوسری طرف راؤ کی پوزیشن کا جہاں تک سوال ہے تو بظاہر ان پر کوئی آنچ آتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ کانگریس جتنی کمزور ہو رہی ہے راؤ اتنے ہی مضبوط ہو رہے ہیں اور یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ راؤ کی گدی عام انتخابات تک یوں ہی سلامت رہے گی۔ جو لوگ اندرونی طور پر راؤ سے ناراض ہیں وہ اس خوف سے زبان نہیں کھول رہے ہیں کہ ان کو حاصل ہونے والی مراعات ختم ہو جائیں گی اس لئے اقتدار کے ارد گرد منڈلانے اور اس سے فائدہ اٹھانے ہی میں انہیں بھلائی اور بہتری نظر آ رہی ہے۔ کانگریس موت و ہزیست کی کشمکش سے دوچار ہے اور یہی کشمکش راؤ کے لئے آب حیات ثابت ہو رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ راؤ کانگریس کو دفن کر کے ہی مطلع سیاست سے غائب ہوتے ہیں یا کانگریس پارٹی کے ہی خواہ اس سے قبل ان کے ہاتھوں سے زمام قیادت چھیننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ●

رمزی یوسف کو امریکہ کے حوالے کر کے

بے نظیر نے امت مسلمہ سے غداری کا ارتکاب کیا ہے

رمزی یوسف کی گرفتاری کی کہانی ایک پاکستانی صحافی کے قلم سے

یہ 26 فروری 1993ء کی ایک پر سکون دوپہر ہے۔ نیویارک کے اہم تجارتی علاقہ میں واقع دنیا کی دوسری بڑی 110 منزلہ عمارت ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں معمول کے مطابق کاروبار زندگی جاری ہے۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں سوا بارہ بجاتی ہیں عمارت ایک خوفناک دھماکہ سے لرز اٹھتی ہے اور دھواں چھا جاتا ہے۔ دھماکے میں چھ افراد ہلاک اور ایک ہزار سے زائد زخمی ہوتے ہیں۔

یہ 6 فروری کی ایک خنک شام ہے، ساڑھے چار بجے کے قریب اسلام آباد کے ایک مہنگے علاقے میں واقع سوکاسا گیسٹ ہاؤس کا مرکزی دروازہ کھلتا ہے اور نیلے سوٹ میں ملبوس درمیانے قد کا ایک کلین شیو نوجوان دو چھوٹے بریف کیس اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے استقبالیہ پر وہ اپنا نام علی محمد درج کرواتا ہے اور ایک ہزار روپے ایڈوانس جمع کرواتے ہوئے یہ بتانے سے گریز کرتا ہے کہ وہ کتنے روز قیام کرے گا اسے دوسری منزل پر واقع کمرہ نمبر 16 کی چابی دی جاتی ہے۔ اسی دوران جب گیسٹ ہاؤس کا ایک ملازم اس کے بریف کیس اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو علی محمد اسے نرمی سے منع کر دیتا ہے اور اپنے دونوں بریف کیس تھامے اپنے کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔

آج 7 فروری 1995ء ہے اور صبح ساڑھے نو بج رہے ہیں چند گاڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ اچانک سوکاسا گیسٹ ہاؤس کے باہر آکر رکتا ہے سادہ کپڑوں میں ملبوس دس لمبے تڑنگے اور پھرتیلے جوان ان گاڑیوں میں سے برآمد ہوتے ہیں جن میں سے چار غیر ملکی معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے ہی یہ لوگ گیسٹ ہاؤس کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں قافلے کی دو گاڑیاں حرکت میں آتی ہیں اور عمارت کے بڑے دروازے کو بلاک کر دیتی ہیں۔

کاؤنٹر پر پہنچتے ہی ایک شخص سوال کرتا ہے کہ کمرہ نمبر 16 کس طرف ہے؟ استقبالیہ کلرک خوف و حیرت کے عالم میں انگلی سے دائیں طرف واقع سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے ساتھ ہی چھ جوان تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہیں باقی چار اسلحہ نکال کر پوزیشن سنبھال لیتے ہیں کمرہ نمبر 16 تک پہنچ کر ایک شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے آواز آتی ہے کون؟ جواب ملتا ہے ویٹر سر۔ جیسے ہی دروازہ کھولا جاتا ہے چھ کا ٹولہ جھپٹ کر علی محمد نامی نوجوان کو دبوچ لیتا ہے اوہ اس کے ہاتھ پاؤں کس کر اور آنکھوں پر کالی پٹی باندھ کر گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے لے جانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دوران علی محمد چیختے ہوئے ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہا ہے میں بے قصور ہوں تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو مجھے گرفتاری کے وارنٹ تو دکھاؤ۔

اسی دوران ایک بڑی گاڑی گیسٹ ہاؤس کے اندر دروازے پر آکر کھڑی ہوتی ہے۔ دس لمبے تڑنگے جوان نکلتے ہیں گاڑی کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور علی محمد کو پچھلی سیٹ پر دھکیل کر دو اہلکار اس کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے ہیں۔ گاڑیاں حرکت میں آتی ہیں اور مختصر سا قافلہ آپریشن مکمل کرنے کے بعد گیسٹ ہاؤس سے روانہ ہو جاتا ہے۔

> پارکر کے چچانے کہا کہ ان کا بھتیجا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور مخبری جیسا قبیح فعل نہیں کر سکتا وہ یقیناً مجبور ہوگا۔ تاہم اگر اس نے یہ حرکت کر لی ہے۔ تب بھی وہ اسے انعامی رقم وصول کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کیوں کہ یہ رقم ایک مسلمان بھائی سے دھوکہ کرنے کے عوض دی جا رہی ہے۔

اور اس طرح نیویارک ورلڈ ٹریڈ سنٹر بم بلاسٹ کا ڈراپ سین ہوا۔ جب دھماکہ کا مرکزی ملزم رمزی احمد یوسف دو سال کی مسلسل کوششوں کے بعد امریکی فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن اور پاکستانی انٹر سروسز انٹلی جنس کے ایک مشترکہ دستے کے ہاتھوں اسلام آباد کے ایک گیسٹ ہاؤس سے گرفتار ہوگیا۔ گرفتاری کے بعد اس کے ایک بریف کیس سے بم بنانے کے لوازمات معہ ایک ریموٹ کنٹرولر برآمد ہوئے۔

امریکی حکام کے مطابق رمزی کی اسلام آباد میں موجودگی کی اطلاع اس کے ایک دوست اشتیاق پارکر نے خود امریکی سفارت خانے پہنچ کر دی رمزی نے ریسٹ ہاؤس کے سلسلے میں پارکر سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ یہ تصدیق کر لینے کے بعد کہ ریسٹ ہاؤس میں واقعی رمزی موجود ہے امریکی سفیر جان مونجو نے رات گئے فون پر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے رابطہ قائم کیا اور ملزم کی گرفتاری کے لئے خفیہ آپریشن کی درخواست کی جس کے بعد وزیر اعظم نے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کو ضروری ہدایت جاری کیں۔ گرفتاری کے اگلے ہی روز ملزم کو ایک خصوصی فلائٹ کے ذریعے اسلام آباد سے نیو یارک پارسل کر دیا گیا۔

1993 میں ہونے والے بم دھماکے کے بعد امریکی ایجنسی ایف بی آئی نے کئی لوگوں کو گرفتار کیا، اور دوران تفتیش رمزی احمد یوسف کا نام مرکزی ملزم کے طور پر سامنے آیا تاہم تمام تر کوششوں کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ رمزی کا ٹھکانہ کہاں ہے۔

ایف بی آئی کے ڈائریکٹر کے مطابق وہ رمزی کو مصر عراق اور ایران میں تلاش کرتے رہے لیکن ملزم کراچی اور اسلام آباد پھرتا رہا، اپنی شناخت چھپانے کے لئے رمزی نے داڑھی منڈالی تھی اور بال سرخ رنگ میں ڈھال لئے تھے۔ رپورٹوں کے مطابق رمزی چند روز قبل ہی پاکستان پہنچا تھا۔

امریکی حکومت کے لئے ٹریڈ سینٹر کی عمارت میں دھماکہ اس لئے شدید تشویش کا باعث تھا کہ اس عمارت میں امریکی سیکرٹ سروس کے بیشتر دفاتر موجود ہیں، جبکہ تہہ خانے میں جہاں کہ دھماکہ

ہوا سیکرٹ سروس کی 110 کاروں پر مشتمل ایک پورا بیڑہ موجود تھا۔ بم پھٹنے سے 8 ہزار فٹ ایریا کو نقصان پہنچا اور عمارت کے تہہ خانے کی چھت بھی بیٹھ گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت میں چھ ہزار افراد

> رمزی کی گرفتاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی صدر کلنٹن کو نیند سے بیدار کر کے اس واقعے کی اطلاع دی گئی اور انہوں نے خود ٹی وی پر آکر اپنی قوم کو اس "خوشخبری" سے آگاہ کیا۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے نام شکریہ کے خط میں صدر کلنٹن نے کہا ہے کہ پاکستانی حکومت کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بین اقوامی دہشت گردی کے خلاف دونوں قوموں کا موقف ایک ہے۔ رمزی کو امریکا کے حوالے کرنے سے پاکستان پر مسلسل عائد کئے جانے والے انتہا پسندی اور دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزامات دھونے میں بھی بڑی حد تک مدد ملے گی۔

روزانہ آتے ہیں۔ بم بذریعہ کار تہہ خانے میں پہنچایا گیا جو کہ ریموٹ کنٹرولڈ اور 200 پونڈ وزنی تھا۔ یہ بم دھماکہ 1975ء کے بعد امریکی تاریخ کا دوسرا بڑا واقعہ تھا جب ٹرانس ورلڈ ایئر لائنز کے ٹرمینل میں دھماکہ کے بعد 11 افراد ہلاک اور 75 زخمی ہو گئے تھے۔ ٹریڈ سینٹر بم بلاسٹ پورے امریکہ کے لئے باعث تشویش تھا۔ امریکہ میں قتل و تشدد کی وارداتیں تو ہوتی ہیں لیکن بم دھماکہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے امریکی عوام پر گہرے نفسیاتی اثرات مرتب کئے۔ اس واقعے سے ایک ماہ قبل 25 جنوری کو ایک شخص نے امریکہ میں سی آئی اے کے تین اہلکاروں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا اور فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا بعد میں امریکی حکومت نے دعوا کیا کہ ملزم کا نام میر عابل کالسی ہے اور وہ پاکستانی ہے۔

ایف بی آئی کے ڈائرکٹر کے مطابق بم دھماکہ کا مقصد امریکن سیکرٹ سروس کے دفاتر کو تباہ کرنا تھا رمزی پر الزام ہے کہ اس نے بموں میں استعمال ہونے والے دھماکہ خیز مواد کی درآمد اور بم کی تیاری کے علاوہ اسے بذریعہ گاڑی عمارت کے تہہ خانے تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ امریکی حکومت نے ملزمان کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لئے 20 لاکھ ڈالر نقد انعام مقرر کیا تھا جو رمزی کے دوست اشتیاق پارکر کے حصے میں آنے والا ہے۔ پارکر مسلمان ہے اور اس کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے۔ پارکر نے 1991ء میں بین اقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ اصول الدین میں داخلہ لیا، وہیں پر اشتیاق کی دوستی ہو گئی۔ رمزی بھی اسی یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور دوران تعلیم اکثر اوقات اسلام آباد کے سیکٹر جی نائن تھری میں اپنے دوست پارکر کے گھر جا کر ٹھہرتا تھا۔ گذشتہ سال پارکر نے شادی کر لی تھی جس کا علم رمزی کو اسلام آباد پہنچ کر ہوا چنانچہ رمزی نے پارکر کے گھر نہ رہنے کا فیصلہ کیا وہ دونوں کی پرائیویسی میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اگر چہ رمزی نے کبھی بھی پارکر کو اپنے اصل نام سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن ٹریڈ سینٹر بلاسٹ کے بعد امریکی حکومت کی طرف سے جاری کردہ پوسٹر پر لگی تصویر سے پارکر اپنے دوست رمزی کی اصل حقیقت جان چکا تھا اور پھر جب دوستی اور روپے کی طاقت میں مقابلہ ہوا تو 20 لاکھ ڈالر بہر حال بھاری تھے۔ پارکر نے اپنا مستقبل سنوارنے کا فیصلہ کر لیا اور رمزی کو گرفتار کروا دیا۔

انعامی رقم وصول کرنے کے لئے پارکر اپنی اہلیہ اور بچی سمیت امریکہ پہنچ چکا ہے اور ایف بی آئی کی حفاظت میں نامعلوم مقام پر رہائش پذیر ہے۔ اپنے بیٹے کی مخبری کے فعل پر تبصرہ کرتے ہوئے پارکر کی والدہ نے کہا کہ اس حرکت سے ان کا پورا خاندان رسوا ہو گیا ہے۔ پارکر کے چچانے کہا کہ ان کا بھتیجا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور مخبری جیسا قبیح فعل نہیں کر سکتا وہ یقیناً مجبور ہوگا۔ تاہم اگر اس نے یہ حرکت کر لی ہے تب بھی وہ اسے انعامی رقم وصول کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چونکہ یہ رقم ایک مسلمان بھائی سے دھوکہ کرنے کے عوض دی جا رہی ہے۔ جنوبی افریقہ کے مشہور تاریخ دان اضمند ڈیوڈ کے مطابق پارکر کی اسلام دوستی ہی اسے ماضی میں بھی اپنے دوست رمزی کی حمایت پر مجبور کرتی رہی ہوگی اور اسی لئے وہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے دوست کی مدد کرتا رہا۔ انہوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ بم دھماکے کے بعد سے ہی پارکر کے گھر کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہو اور رمزی کے وہاں پہنچنے اور اپنے دوست سے ملنے کے بعد پارکر کے پاس مخبری کا الزام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ بچا ہو۔

دوسری طرف رمزی کی اصل قومیت ابھی تک امریکن ایف بی آئی کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ بعض حلقوں نے اسے عراقی نژاد قرار دیا ہے بعض اسے پاکستانی والدین کی کویتی اولاد قرار دے رہے ہیں بعض اسے اردن سے تعلق رکھنے والا فلسطینی اور بعض اسے عیسائی بتاتے ہیں ایف بی آئی تو یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ رمزی ہی ملزم کا اصل نام ہے۔

رمزی سے برآمد ہونے والی نوٹ بک سے پاکستان اور ایران میں اس کے رابطوں کا پتہ چلتا ہے جبکہ شکل و صورت سے وہ بلوچستان کی ساحلی پٹی کا باشندہ دکھائی دیتا ہے۔ شناختی کارڈ میں اس کا نام علی محمد اور سکونت پسنی مکران درج ہے جب کہ پاکستانی پاسپورٹ میں اس کا پتہ نزد عثمانیہ مسجد جہاں گیر آباد کراچی لکھا ہوا ہے۔ تاہم وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کے مطابق رمزی کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دونوں جعلی ہیں۔

ایف بی آئی کی تحقیقات کے مطابق رمزی یوسف افغان جہاد میں بھی روسیوں کے خلاف

باقی صـ ۱۴ پر

"ویلفیئر" میئروں کی جانب سے سرکاری تفریح گاہوں میں شراب پر پابندی

ترکی کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی مہم شروع؟

> ویلفیئر کے میئر دوسرے شہروں میں بھی شراب نوشی کی وبا ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کم از کم میونسپلٹی اور کارپوریشن کے اداروں میں شراب نوشی پر پابندی وہ اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ انقرہ کے ویلفیئر میئر نے دارالحکومت کے پارکوں سے بعض عریاں مجسموں کو یہ کہہ کر ہٹا دیا ہے کہ ان سے بے حیائی کو فروغ ملتا ہے۔

گذشتہ سال مارچ میں ترکی کے مقامی اداروں کے انتخابات میں فلاح یا ویلفیئر پارٹی کو زبردست کامیابی ملی تھی جس کے نتیجہ میں استنبول اور انقرہ جیسے اہم شہروں کی میئر شپ پر اس کا قبضہ ہوگیا ہے۔ چونکہ ویلفیئر پارٹی اسلام کی علمبردار تصور کی جاتی ہے اس لئے یہ بات فطری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے گی جس سے اس کی پالیسی کا اظہار ہوتا ہو۔ چنانچہ انقرہ اور استنبول کے ویلفیئر میئروں نے بعض ایسے قدم اٹھائے ہیں جو عین اسلام کے مطابق ہیں مگر وہاں کے سیکولر اس سے بوکھلا گئے ہیں۔

استنبول کا مالٹا محل ایسی 12 تفریح گاہوں میں سے ایک ہے جہاں شراب کھلے عام بکتی ہے چونکہ یہ میونسپلٹی کے زیر اہتمام ہے اس لئے ویلفیئر نے یہاں شراب پر پابندی لگادی ہے۔ یہ محل فاسفورس کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے اور زائرین بالعموم شراب کا گلاس ہاتھوں میں تھامے ہوئے خوبصورت مناظر کا یہاں سے نظارہ کرتے ہیں مگر اب یہاں زائرین ضرور آتے ہیں البتہ انہیں کافی چائے اور دوسرے حلال مشروبات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

ترکی کے سیکولر عناصر ویلفیئر میئر کے اس اقدام کو استنبول کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی پہلی کوشش سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ترکی کا سیکولر طبقہ جو 1924 میں خلافت کے خاتمہ کے بعد سے وہاں برسراقتدار رہا ہے اور جس کی وجہ سے وہاں کا مراعات یافتہ گروہ بھی بن گیا ہے ویلفیئر کی اسلامی کوششوں کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ترکی کی اکثریت مسلمان ہے لیکن سرکاری طور پر یہ سیکولر ملک ہے اور وہاں کا مراعات یافتہ طبقہ اسے اسی انداز میں قائم رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اس کا مفاد اسی میں مضمر ہے۔

استنبول میں تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ آباد ہیں یہاں سرکاری عمارتوں میں مالٹا محل جیسی 12 تفریح گاہیں ہیں۔ ویلفیئر میئر طیب اردوگان ان تفریح گاہوں سے شراب ختم کرکے وہاں صرف کافی چائے اور ایسے دوسرے جائز مشروبات کے حق میں ہیں۔ یہ وہ اپنے انتخابی منشور میں کئے گئے وعدے کی تکمیل کے طور پر کر رہے ہیں۔ ان سرکاری تفریح گاہوں میں شراب پر پابندی لگنے کے بعد بھی ترکی میں شراب بہرحال ملتی ہے کیونکہ بہت سی نجی ملکیت کی دوکانیں اسی کا کاروبار کرتی ہیں۔

اسلام میں شراب ممنوع ہے اور ترکی کی اکثریت اس سے اجتناب کرتی ہے۔ مغرب زدہ سیکولر ترکوں کا ایک مختصر مگر مراعات یافتہ گروہ شراب کا عادی ہے چونکہ یہی گروہ مدتوں سے برسر اقتدار رہا ہے اس لئے اس نے شراب نوشی کو قانونا جائز قرار دے رکھا ہے۔ یہ اقلیتی سیکولر طبقہ اپنی شام کو شراب وکباب سے رنگین بنا کر گزارنے کا عادی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے ویلفیئر میئر کے شراب پر پابندی لگانے کے اقدام کی زبردست تنقید کی ہے

کاروں اور سیاحت کے ایک کلب کے انچارج سیلک کا کہنا ہے کہ جن بارہ سرکاری تفریح گاہوں میں شراب کی فروخت پر پابندی لگی ہے وہ سیاحوں میں کافی مقبول ہیں۔ ان کے بقول یہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر ویلفیئر میئر نے ان تفریح گاہوں میں شراب نوشی پر پابندی کیوں لگادی ہے سیلک کی ناراضگی قابل فہم ہے کیونکہ اس سے ان کے بزنس پر براہ راست زد پڑی ہے۔ بارہ سال قبل ان بارہ تفریح گاہوں کو ان کے کلب نے حکومت سے پٹے پر لے لیا تھا اور ان کی سجاوٹ پر ڈیڑھ ملین ڈالر خرچ کیا تھا۔ اب ان تفریح گاہوں میں شراب پر پابندی سے انہیں اپنی تجارت ماند پڑنے کا خطرہ ہے۔ مگر اسلام پسندوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مغربی سیاح محض چند گھونٹ شراب کے لئے ترکی آتے ہیں۔

تفریح گاہ کے مالکوں کے ساتھ ترکی کا سیکولر طبقہ بھی ویلفیئر کے میئر کے اقدام کی مخالفت برابر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جو لوگ اس خوش فہمی میں تھے کہ ویلفیئر کے منتخب میئر اپنے طرز فکر یعنی "بنیاد پرستانہ طرز حیات" کو دوسروں پر نافذ نہیں کریں گے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوجانا چاہئے۔ حریت اخبار کے ایک اداریے نے تو یہ تک لکھ دیا ہے کہ "ویلفیئر کا طرز فکر بہت سے میدانوں میں ترکی کے عام انداز زندگی سے میل نہیں کھاتا"

ویلفیئر کے میئر دوسرے شہروں میں بھی شراب نوشی کی وبا ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کم از کم میونسپلٹی اور کارپوریشن کے اداروں میں شراب نوشی پر پابندی وہ اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ انقرہ کے ویلفیئر میئر نے دارالحکومت کے پارکوں سے بعض عریاں مجسموں کو یہ کہہ کر ہٹا دیا ہے کہ ان سے بے حیائی کو فروغ ملتا ہے۔ پارلیامنٹ میں ویلفیئر سے تعلق رکھنے والے ایک ممبر نے اس وقت گویا ایک بم گرادیا جب انہوں نے استنبول سے بعض رومی نژاد قلعوں کی جگہ پر نئی عمارتیں بنانے کی تجویز رکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تجویز اس لئے پیش کی گئی تھی تاکہ رہائش کا سنگین مسئلہ حل کیا جاسکے۔ مگر وہاں کے سیکولر عناصر نے اس تجویز کے سامنے آنے کے بعد ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ویلفیئر ترکی کے اسلامی ورثے کے علاوہ دوسرے تمام آثار مٹادینا چاہتی ہے۔

گذشتہ سال مارچ کے انتخابات میں ویلفیئر کو 25 فیصد ووٹ ملے تھے۔ مگر چونکہ دوسری پارٹیوں کے ووٹ باہمی نااتفاقی کی وجہ سے تقسیم ہوگئے تھے اس لئے کئی شہروں کی میئر شپ پر ویلفیئر کا قبضہ ہوگیا۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تین پارٹیوں کا مجموعی ووٹ 34 فیصد اور سنٹرسٹ پارٹیوں کا مجموعی ووٹ 37 فیصد تھا۔ مگر باہمی اختلافات کی وجہ سے انہیں بہت کم شہروں کی میئر شپ حاصل ہوسکی۔

ویلفیئر جن شہری اداروں پر قابض ہے وہاں کے غریب عوام کے لئے مختلف پروگرام شروع کر رہی ہے جس کی وجہ سے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ پہلے عوام محض ان کی ایمانداری اور کرپشن سے پاک صاف امیج کی وجہ سے ووٹ دیتے تھے لیکن ویلفیئر جس انداز سے شہری مسائل حل کرنے میں لگی ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ لوگ اسے ایک کام کرنے والی پارٹی سمجھ کر بھی ووٹ دیں گے۔ •

کیا اسطرح بے گھر فلسطینیوں کی واپسی کا مسئلہ حل ہوجائے گا؟

7 مارچ کو عمان میں اسرائیل، مصر، اردن کے وزرائے خارجہ اور فلسطینی انتظامیہ کے نمائندے نبیل شاط نے ایک کانفرنس میں اس مقصد کے لئے شرکت کی تھی تاکہ 1967ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ میں بے گھر ہوئے فلسطینیوں کو اپنے وطن واپس ہونے کے لئے راہ ہموار کی جاسکے۔ مگر ان مذاکرات کے بعد کوئی نتیجہ اسکے علاوہ برآمد نہ ہوسکا کہ اسی مسئلہ پر گفتگو کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی ہے۔

1967ء کی جنگ میں بے گھر ہوئے فلسطینیوں کو عام طور سے Displaced یا اجاڑے گئے لوگوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جبکہ 1948ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت یہودی دہشت گردی کے نتیجہ میں جن لوگوں کو اپنا گھربار چھوڑنا پڑا تھا انہیں Refugee یا پناہ گزیں کہا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے مطابق ان تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کا حق حاصل ہے۔

مگر 8 مارچ کے چہار رخی مذاکرات صرف اجاڑے گئے لوگوں کی واپسی کے بارے میں تھے۔ مذاکرات کے بعد مصر کے وزیر خارجہ عمرو موسی نے کہا کہ اس میٹنگ سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا خصوصاً عربوں کے مطالبات پورا کرنے میں یہ ناکام رہی۔

مذاکرات کے دوران یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی ہے کہ نہ صرف عربوں اور اسرائیل کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف ہے بلکہ خود عربوں یعنی اردن، مصر اور پی ایل او کے درمیان بھی کافی اختلافات ہیں۔ یہ بات عمان سے قاہرہ واپس آنے کے بعد مصری وزیر خارجہ نے ایک بیان میں کہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پہلے اس مرحلے پر اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

فلسطینی نمائندے نبیل شاط بھی مذاکرات کے بعد مایوس نظر آئے۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ یہ میٹنگ کسی ٹھوس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکی۔ انہیں امید تھی کہ اس میٹنگ کے بعد کم از کم سو فلسطینی خاندانوں کو غازہ پٹی اور مغربی کنارے پر اپنے گھروں کو واپس ہونے کی فوری اجازت مل جائے گی۔ لیکن ان کے بقول اسرائیل اس طرح کے ٹھوس اقدامات کو زیر بحث لانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

یہ بے گھر فلسطینی خواتین کب تک احتجاج کرتی رہیں گی؟

اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے میٹنگ سے پہلے ہی آگاہ کردیا تھا کہ ان کا ملک اس مسئلے پر محتاط رویہ اختیار کرے گا اور یہ کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں وقت لگے گا۔ بعد میں میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے پیریز نے یہ الفاظ کہے "ہمیں ایک ایسا حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے اس مسئلے کی وسعت وفطرت کا اندازہ کرکے اسے ایجنڈے پر لانے میں مدد لے۔"

بہرحال میٹنگ کے بعد جو اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں اسٹینڈنگ کمیٹی کے علاوہ ایک تکنیکی کمیٹی کے قیام کا بھی ذکر ہے جس میں ہر ملک کے تین تین ماہر افسران شامل ہوں گے۔ اس تکنیکی کمیٹی کی پہلی میٹنگ ایک ماہ کے اندر اور اسکے بعد ہر تین ہفتے پر ہوا کرے گی۔ اس کمیٹی کے مباحث پر غور کرنے اور اگر کوئی رکاوٹ پیش آئے تو اسے دور کرنے کے لئے ہر دو یا تین ماہ پر وزارتی سطح کی میٹنگ ہوگی جس کا بنیادی مقصد اعتماد کا ماحول

تکنیکی کمیٹی کی میٹنگ جسے 7 مارچ کے بعد ایک ماہ کے اندر ہونا ہے یعنی 7 اپریل سے پہلے، اس کے سامنے ایک بڑا مسئلہ 1967ء میں بے گھر کئے گئے افراد کی تعداد کا تعین بھی ہوگا۔ یاسر عرفات کی زیر قیادت فلسطینی اتھارٹی کا کہنا ہے کہ بے گھر ہوئے لوگوں کی کل تعداد 15 لاکھ ہے جن کے زیادہ تر ورثاء اردن میں رہتے ہیں۔ یاسر عرفات ان کی مرحلہ وار واپسی کے خواہش مند ہیں تاکہ ان کے بقول روزگار کے متلاشیوں کے سیلاب سے بچا جا سکے۔ شاید یاسر عرفات کو معلوم نہیں کہ پہلے ہی غازہ پٹی اور مغربی کنارے پر بے روزگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔

فلسطینی اتھارٹی کے برعکس اقوام متحدہ کے مطابق بے گھر کئے گئے لوگوں کی کل تعداد تین لاکھ پچاس ہزار ہے۔ اسرائیل متوقع طور پر اسے گھٹا کر ڈیڑھ سے دو لاکھ کے بیچ میں بتاتا ہے۔ یاسر عرفات نے پندرہ لاکھ کی تعداد بتا کر غالباً مختلف ملکوں میں رہنے والے ان فلسطینی پناہ گزینوں کو بھی اس میں شامل کرلیا ہے جنہیں 1948ء میں اپنا گھربار چھوڑنا پڑا تھا۔

پناہ گزینوں کے بارے میں خاموشی یاسر عرفات کے لئے مسئلہ پیدا کرسکتی ہے۔ حماس اور اسلامی جہاد کا پی ایل او۔ اسرائیل معاہدے پر ایک بڑا اعتراض یہی ہے کہ پناہ گزینوں کے بارے میں کوئی ٹھوس تجویز یا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ دراصل مغربی ایشیا میں پائدار امن کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اجاڑ دیے گئے لوگوں کو غازہ اور مغربی کنارے پر آباد ہونے کا حق دیا جائے بلکہ 1948ء میں بے گھر کئے گئے پناہ گزینوں کو بھی موجودہ اسرائیل میں واپس جاکر اپنے گاؤں اور گھروں میں آباد اور اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کرنے کا حق دیا جائے۔ مگر کیا اسرائیل کبھی یہ منصفانہ قدم اٹھانے کے لئے تیار ہوگا؟ یہ ایک اہم اور مشکل سوال ہے جس کا اسرائیلی جواب ظاہر ہے نفی میں ہوگا۔ اور یہ نفی حماس اور اسلامی جہاد جیسے گروہوں کو ہمیشہ مسلح جدوجہد پر ابھارتی رہیگی۔ •

اسرائیل گروزنی کے یہودیوں کو خفیہ طریقے سے

مقبوضہ عرب علاقوں میں بسانے کی سازش کر رہا ہے

کم لوگوں کو معلوم ہے کہ چیچنیا خصوصاً دارالحکومت گروزنی میں یہودی بھی آباد تھے جنہیں اب اسرائیل میں لاکر بسایا جارہا ہے۔ اسرائیل نے دوسرے ممالک کے بحرانوں سے فائدہ اٹھاکر وہاں آباد یہودیوں کو مقبوضہ عرب علاقوں میں لاکر بسانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ اس کی تازہ ترین کوشش کے نتیجہ میں گروزنی کے یہودی بڑی خاموشی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ اسرائیل لائے گئے اور اب انہیں وہاں بسانے کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ چیچن مجاہدین اور بربریت پر آمادہ روسی فوجوں کے درمیان ہورہی گھمسان کی جنگ کی خبروں میں اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ اس اہم خبر کی طرف کم ہی لوگوں کی توجہ گئی۔ یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ گروزنی سے اسرائیل لائے گئے یہودیوں کی تعداد کیا ہے مگر انہیں وہاں سے لانے کی دلیل اسرائیل اور یہودی تنظیموں نے یہ دی ہے کہ انہیں روسی حملوں سے بچانا تھا گویا جب وطن پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے اور قربانی دینے کا وقت آیا تو یہودی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اسرائیل نے اس میں ان کی پوری مدد کی۔

چند سال قبل ایتھوپیا کی خانہ جنگی کا فائدہ اٹھا کر بھی اسرائیل نے وہاں کے فلاشہ یہودیوں کو غیر قانونی طریقے اختیار کرکے اسرائیل میں لاکر بسایا تھا۔ واضح رہے کہ ایسے سارے یہودیوں کو مقبوضہ عرب علاقوں کی نو آبادیوں میں بسایا جاتا ہے۔

صیہونی تحریک نے اسرائیل کے قیام سے بلکہ اس سے پہلے ہی سے دوسرے ممالک میں آباد یہودیوں کو فلسطین میں لاکر آباد کرنے کے مختلف

ایک روسی فوجی چیچنیا میں ایک مسجد کے گنبد پر ہلال کو نشانہ بناتے ہوئے

طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ مغربی حکومتیں ان کے اس غیر قانونی مشن میں ہمیشہ برابر کی شریک رہی ہیں۔ جب بھی کسی ملک میں کوئی بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے یہودی مغربی حکومتوں اور دوسرے اداروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ متعلقہ ملک پر دباؤ ڈال کر یہودیوں کو اسرائیل "ہجرت" کرنے کی اجازت دیں۔ ابھی چند سال قبل جب سوویت یونین کا زوال ہوا تھا تو اس وقت بھی مغربی حکومتوں خصوصاً امریکہ نے روس پر دباؤ ڈال کر بے شمار یہودیوں کو اسرائیل لانے کا راستہ ہموار کیا تھا جنہیں بعد میں مقبوضہ علاقوں میں آباد کیا گیا۔ اس سے قبل بھی امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک سوویت یونین اور دوسرے ممالک پر یہودیوں کے دباؤ کی وجہ سے زور دیتے تھے کہ وہ یہودیوں کو اسرائیل جانے کی اجازت دیں۔ واضح رہے کہ روسی یہودیوں کی اکثریت امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں آباد ہونا چاہتی تھی مگر انہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ امریکہ جلد ہی سو کے قریب ایسے یہودیوں کو اسرائیل بھیجنے والا ہے جو وہاں غیر قانونی طور پر پہونچ گئے ہیں۔ مگر یہی ممالک دوہرا معیار اختیار کرتے ہوئے ان یہودیوں کو مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں آباد کئے جانے پر یا تو خاموش رہتے ہیں یا بے جان سا احتجاج کرکے رہ جاتے ہیں۔ اسرائیل کی مدد سے باقاعدہ دو یہودی تنظیمیں امریکہ و مغربی ممالک میں قائم ہیں جن کا مقصد غیر مغربی ممالک کے یہودیوں کو وہاں سے لاکر اسرائیل یا بہ الفاظ دیگر مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں آباد کرنا ہے۔ ان تنظیموں کا مغربی حکومتوں اور افسروں پر کافی اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مغربی حکومتیں ان کی مدد کرتی ہیں حالانکہ اس طرح وہ تسلیم شدہ بین اقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہیں مگر کبھی اسے تسلیم نہیں کرتیں۔

اسرائیل اور مغربی حکومتوں کے تعاون سے اب تک لاکھوں یہودی غیر قانونی طور پر مقبوضہ فلسطین میں آباد کئے جاچکے ہیں مگر ان فلسطینیوں کو جنہیں اسرائیل کے قیام سے پہلے اور بعد میں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور جو آج بھی مغربی کنارے، غازہ پٹی، اردن، لبنان شام اور دوسرے عرب ممالک کے پناہ گزیں کیمپوں میں انتہائی غربت اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، اپنے گھروں اور گاؤں کو لوٹنے اور وہاں از سر نو آباد ہونے اور زندگی گزارنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس ضمن میں انسانی تہذیب و شرافت، حقوق انسانی، بین الاقوامی قوانین و ضوابط اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کا جس کا اسرائیل نے مغرب کی مدد سے کھلم کھلا مذاق اڑایا ہے وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ وہ مغرب جو ہمیشہ انسانی حقوق کی دہائی دیتا رہتا ہے فلسطینیوں کو ان کی موجودہ کسمپرسی کی حالت تک پہونچانے میں نسل پرست اور دہشت گرد اسرائیل سے کم ذمہ دار نہیں ہے۔

مگر اس ضمن میں مغرب کو برا بھلا کیوں کہا جائے بہت سے عرب ممالک اسرائیل سے دوستانہ تعلقات قائم کرچکے ہیں یا ایسا کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ آج بھی ہمشیہ کی طرح عربوں کی صفوں میں انتشار ہے جس کا اسرائیل ہمیشہ اپنے فائدے کے لئے استحصال کرتا رہا ہے۔ اپنے اسی انتشار اور عدم اتحاد کی وجہ سے عرب ممالک اسرائیل اور مغرب کی نا انصافیوں، زیادتیوں اور دوہرے معیار کے خلاف آواز اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں نتیجہ ظاہر ہے کہ امریکہ کی قیادت میں مغربی ممالک اور اسرائیل اس علاقے میں اپنی من مانی کررہے ہیں۔

●

چیچنیا کی جنگ سے روسی سیاست تہہ و بالا ہوگئی

چیچنیا کے انتشار کے ساتھ روسی سیاسی منظر کے یکسر بدل جانے سے اصل جمہوری پارٹی بری طرح بحران کا شکار ہوئی اور پہلے ہی سے منقسم دھڑوں کے درمیان اختلافات اور گہرے ہوگئے ہیں۔ اور اب روسی پارٹیاں دسمبر میں ہونے والے انتخابات کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز تر کررہی ہیں۔ مختلف طرح کے سیاسی سمجھوتوں کے حیران کن امکانات بھی سامنے آرہے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چیچنیا نے بودے روابط کو توڑ کر نئے رشتے استوار کرلیے ہیں۔

موجودہ روسی سیاست کا دوسرا نام ڈیموکریٹ اور کمیونسٹ کے درمیان یا لبرل اور کنزرویٹو عناصر کے درمیان رسہ کشی ہے۔ اور پارٹی کے درمیان باہمی رشتوں کی نوعیت چیچنیا کے بحران سے طے ہوگی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر سیاسی مبصرین یہ قیاس آرائیاں نہ کررہے ہوں کہ اگلے سال جون میں عوامی ایوان کے متوقع انتخابات میں فتح کس کی ہوگی۔ ان میں سب سے زیادہ تر لوگ اس پر متفق ہیں کہ روسی ڈیموکریٹک پارٹی کو اب تک ناکامیوں کا سامنا رہا ہے۔ ڈیموکریٹک کیمپ کے اندر خود شدید اختلافات ہیں اور چیچنیا کے تئیں اپنے رویے سے ڈیموکریٹک پارٹی نے رائے دہندگان میں اپنی ساکھ کھو دی ہے۔ پارٹی کے سربراہ یگور گائدر نے جب سے صدر یلتسن کے خلاف نمایاں طور پر مخالفانہ موقف اختیار کیا اس وقت سے پارٹی میں مزید انحطاط آیا ہے۔ اس اختلاف کے نتیجے میں بعض اہم اور بارسوخ ممبران نے بھی پارٹی کو خیرباد کہہ دیا۔ دوسری طرف اس سے پارلیمنٹ میں یلتسن کے وفادار ترین عناصر نے بھی منہ پھیر لیا اور پارٹی کی انتخابی حکمت عملی انتشار ذہنی کا شکار ہوگئی۔ روسی چوائس پارٹی کو دسمبر کے انتخابات میں یلتسن کی طرف سے پوری حمایت کی توقع تھی جس کے بدلے میں وہ صدارتی انتخاب میں یلتسن کی حمایت کرتی۔ پارٹی کے ایک اہم ممبر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چیچنیا کی صورت حال کے مد نظر وہاں سے کوئی کامیاب نہیں ہوسکتا اور یہ کہ پارٹی کی حیثیت کے مطابق حالیہ استصواب سے وہ پر امید ہیں لیکن چوائس کے ایک قریبی ذریعے کا کہنا ہے کہ پارٹی کے اندر شدید انتشار اور بد نظمی ہے۔

بعض مبصرین کا یہ بھی خیال تھا کہ ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے چیچنیا کے بحران کی مخالفت سے انہیں متحد ہونے کا ایک موقع فراہم ہوجائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ چوائس اور دیگر ڈیموکریٹک گروہوں میں بھی اختلاف اپنی جگہ اسی طرح قائم ہے جس کی بڑی وجہ ان کی ذاتی اغراض اور فوج میں شامل ہونے کی ان کی روایتی نا اہلیت ہے۔ متحد پلیٹ فارم پر الیکشن لڑنے میں ناکامی پارلیمنٹ میں اصلاح پسندوں کے وجود کو کمزور کرسکتی ہے کیوں کہ بعض لبرل پارٹیاں نشستوں کے حصول کے لئے مطلوبہ پانچ فیصد ووٹ بھی نہیں پاسکیں گی۔

صدارتی انتظامیہ کے سربراہ سرگی فلاتوف کے مطابق ڈیموکریٹک کیمپ میں اتحاد اور اشتراک عمل کے جذبے کا فقدان ہے اور ایسی صورت میں ملک کی جمہوری بقا کو لاحق خطرات بالکل نمایاں ہیں۔ زرینووسکی کی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی آف رشیا (ایل ڈی پی آر) اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی امید کرسکتی ہے۔ اس پارٹی نے دسمبر 1993 میں عوامی ایوان (دوما) کے لئے دسمبر 1993 کے انتخابات میں ایک چوتھائی نشستیں حاصل کی تھیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ آج بھی یہ ایک ایسی طاقت بنی ہوئی ہے جسے کسی شمار میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس پارٹی کو 1993 کے مقابلے میں کافی کم ووٹ ملیں گے کیوں کہ زرینووسکی کا مرتبہ عوام کی نظروں سے گر گیا ہے اور چیچنیا کی جنگ عوام کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے میں ناکام رہی ہے۔

چیچنیا کے معاملے میں زرینووسکی کی طرف سے یلتسن کے موقف کی حمایت بھی عارضی ہے۔ ایسے منہ پھٹ وطن پرست کے ساتھ کوئی مستحکم اتحاد خارج از بحث نظر آتا ہے۔ نو تشکیل شدہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اور فارورڈ رشن گروپ کو امید ہے کہ وہ روسی سیاست میں پیدا ہونے والے خلا کو پر کرسکیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں مبالغہ ہو لیکن اس کا کافی امکان ہے کہ کمیونسٹ پارٹی بڑے چیلنجوں پر بھی غالب آجائے۔ چیچنیا کے مسئلے پر اس پارٹی کے اندر اختلافات نہیں ہیں اور اس نے حکومت پر اس ضمن میں واضح الفاظ میں تنقید بھی کی ہے۔ معروف روزنامہ "ازوستیا" کے مطابق کمیونسٹوں کو پارلیمنٹ میں چالیس فیصد نشستیں مل سکتی ہیں۔ تاہم تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس اندازے میں مبالغے سے کام لیا جارہا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی اور ایل ڈی پی آر کے اتحاد کی بات بھی سننے میں آئی ہے۔ لیکن چیچنیا کے حالات کے مد نظر اس کا امکان بہت ہی کم ہے۔ کیوں کہ ایل ڈی پی آر فوجی کارروائی کی حامی ہے اور کمیونسٹ اس کے سخت مخالف۔

کئی مبصرین کی رائے ہے کہ اگرچہ روسی سیاست بدل چکی ہے واضح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کامیابی کسے حاصل ہوگی اور ممکن ہے کہ انتخابات کے آخری نتائج عوامی ایوان کے ڈھانچے میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہ لاسکیں۔

●

امیر اسرائیل کے لیے غریب ملک کے شاہ کی سخاوت

کیا اردن میں سب خیریت ہے؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردن میں سب خیریت ہے۔ لیکن حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے شاہ حسین کے اسرائیل سے دوستانہ تعلقات کم از کم عوام کی نظروں میں بہت مقبول نہیں ہیں۔ اگرچہ شاہ حسین کا دعویٰ ہے کہ اردن کی اکثریت اسرائیل سے تعلقات نارمل کرنے کی کوششوں کی حمایت کرتی ہے لیکن شاید حقیقت اس کے برعکس ثابت ہو اگر اس مسئلہ پر کوئی ریفرنڈم کرایا جائے۔ دوسرے عربوں کی طرح اردن کے عوام بھی امن کے حامی ہیں لیکن جن شرائط پر اور جس انداز اور تیزی سے شاہ حسین دوستانہ معاہدوں پر دستخط کر رہے ہیں وہ انہیں پسند نہیں ہے۔ خاص طور سے ایسے وقت میں جب جارڈن ٹائمز کے کالم نگار رامی خوری کے الفاظ میں "اسرائیل نہ صرف عرب علاقوں پر قابض ہے بلکہ انہیں جیلوں میں بند کر کے ایذائیں دے رہا اور قتل کر رہا ہے۔" تل ابیب سے عمان کے گہرے تعلقات اردن کے حق میں بہتر نہیں ہیں۔

اردن کے عوام اپنے حکمراں کے ذریعے اسرائیل سے کئے گئے معاہدہ امن سے خاص طور سے ناراض ہیں جو شاہ حسین نے کسی سے مشورہ کئے بغیر خود ہی تن تنہا انجام دیا ہے۔ وہ بالخصوص معاہدے کی اس شق سے ناراض ہیں جس کے مطابق اردن کا ایک زرخیز علاقہ غیر معینہ مدت کے لئے اسرائیل کو پٹے پر دے دیا گیا ہے جس میں اسرائیلی کسان پہلے کی طرح کھیتی باڑی کرتے رہیں گے۔ یہ سخاوت ایک غریب ملک کی طرف سے ایک امیر ملک کے لئے کی گئی ہے جس پر ظاہر ہے وہاں کے عوام ناراض ہوں گے ہی۔

امیدوں اور پروپیگنڈوں کے برعکس اسرائیل سے دوستی کے معاہدے کے بعد اردن کے عوام کو وہ کچھ نصیب نہیں ہوا ہے جنہیں عام طور سے "امن کی نوازشات" کے نام سے یاد کیا جا رہا تھا۔ بلاشبہ امریکہ نے اردن کے کچھ نہ کہ تمام قرضے معاف کر دیئے ہیں، کہا جا رہا تھا کہ امن کے بعد بے شمار اسرائیلی سیاح اردن آکر وہاں کی معاشی حالت کو سدھارنے میں مدد دیں گے مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے۔ بعض اسرائیلی Petra کی سیاحت کے لئے ضرور آتے ہیں مگر صرف دن بھر کے لئے۔ اور وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر آتے ہیں۔ گویا جو آتے ہیں ان سے بھی اردن کے لوگوں کو کوئی خاص معاشی فائدہ نہیں ہے۔

> امیدوں اور پروپیگنڈوں کے برعکس اسرائیل سے دوستی کے معاہدے کے بعد اردن کے عوام کو وہ کچھ نصیب نہیں ہوا ہے جنہیں عام طور سے "امن کی نوازشات" کے نام سے یاد کیا جارہا تھا۔ بلاشبہ امریکہ نے اردن کے کچھ نہ کہ تمام قرضے معاف کر دیئے ہیں، کہا جا رہا تھا کہ امن کے بعد بے شمار اسرائیلی سیاح اردن آکر وہاں کی معاشی حالت کو سدھارنے میں مدد دیں گے مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے۔

لیکن سب سے بڑھ کر اردن کے اکثر لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ اسرائیل سے پرجوش تعلقات کی وجہ سے وہ اپنے عرب بھائیوں سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ وہ شاہ کی حکومت کے خلاف بہ انداز دیگر اپنے احساسات کا اظہار بھی کرنے لگے ہیں، ابھی حال ہی میں اردن کی پارلیامنٹ ایک قانون کو جس کے ذریعے اسرائیل سے تعلق قائم کرنے اور تجارت کرنے پر پابندی تھی، ختم کرنے میں اس لئے ناکام ہو گئی کہ مطلوبہ کورم پورا نہیں ہو سکا تھا۔ دراصل 80 رکنی پارلیامنٹ کے اس خاص اجلاس کا اسلامک ایکشن فرنٹ نے بعض دوسری چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ مل کر بائیکاٹ کیا تھا جس کی وجہ سے کورم پورا نہیں ہو سکا۔

اسی طرح بعض دوسرے ذرائع سے بھی اردن کے عوام اسرائیل کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً عمان میں اسرائیل کے سفارتخانے کے تئیں وہ سرد مہری کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اسرائیلی سفارتکاروں کو کرائے پر اپنے مکانات دینے سے کتراتے اور سفارتخانے کی پارٹیوں میں شامل ہونے سے بچتے ہیں، تقریباً 12 پیشہ ورانہ تنظیموں نے جن میں 80 ہزار کے قریب نرسیں، ڈاکٹر انجینیر اور وکلا وغیرہ شامل ہیں، اپنے طور پر اسرائیل کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے۔

مگر مذکورہ باتوں میں سے کوئی بھی شاہ حسین کے اسرائیل کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو روک نہیں سکتی۔ فلسطینی اس وقت اردن کی آبادی کا 70 فیصد ہیں۔ ان میں سے اکثر اب بھی شاہ کے اس بات کے لئے احسان مند ہیں کہ انہوں نے انہیں اس وقت پناہ دی تھی جب اسرائیلی دہشت گردی کی وجہ سے انہیں گھربار چھوڑنا پڑا تھا۔ مگر اس کے ساتھ شاہ کی اسرائیل دوستی سے وہ ناخوش بھی ہیں خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ دوسرے کئی مقامات پر فلسطینیوں اور عربوں پر اسرائیل مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ کتنے تو اب واضح لفظوں میں کہنے لگے ہیں کہ شاہ نے اسرائیل سے دوستی عام عربوں یا اردنی عوام کے لئے نہیں بلکہ اپنی خاندانی بادشاہت کو مضبوط کرنے کے لئے کی ہے۔

اگرچہ اردن عوام خصوصاً پناہ گزیں کیمپوں میں رہنے والے فلسطینیوں کا غصہ ابھی بغاوت کی سرحد سے بہت دور ہے لیکن اگر شاہ نے اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کی تو یہ مرحلہ بھی آسکتا ہے۔ خود عمان میں فلسطینیوں کی ایک بہت بڑی تعداد موت وحدت کیمپ میں انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق اردن کے ان غریب لوگوں کی تعداد میں جنگ خلیج کے بعد زبردست اضافہ ہوا ہے تقریباً 50 فیصد روزانہ کی کمائی پر گزر بسر کرتے ہیں۔ اردن کے چالیس لاکھ میں 30 فیصد لوگ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ 1992ء سے نہ صرف غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بلکہ غریب کی وجہ سے جہالت بڑھی اور صحت کے معیار میں بھی زوال آیا ہے۔

> اگرچہ اردن عوام خصوصا پناہ گزیں کیمپوں میں رہنے والے فلسطینیوں کا غصہ ابھی بغاوت کی سرحد سے بہت دور ہے لیکن اگر شاہ نے اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کی تو یہ مرحلہ بھی آسکتا ہے۔

اردن کے غرباء میں کم از کم پانچ فیصد ایسے ہیں جو غریبی کی لائن سے نیچے ہیں یعنی جن کے پاس کھانے کے لئے کھانا رہنے کے لئے مکان اور پہننے کے لئے کپڑا نہیں ہے۔ ان کے لئے حکومت کے علاوہ تقریباً ساڑھے سات سو ملکی و غیر ملکی رضاکار تنظیمیں سرگرم عمل ہیں جس سے انہیں روزانہ پیٹ بھرنے کو کچھ مل جاتا ہے مگر کوئی ایسی اسکیم زیر عمل نہیں ہے جس سے ان کی غربت کا مستقل خاتمہ ہو سکے۔

اردن دراصل ایک مصنوعی ملک ہے پوری تاریخ میں مغربی کنارے سے علیحدہ اس کا وجود بے معنی رہا ہے۔ چنانچہ آج یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے وسائل آمدنی انتہائی محدود ہیں۔ فی کس سالانہ آمدنی 12 سو ڈالر سے کم ہے۔ ملک کی آبادی کے 25 فیصد سے زیادہ لوگ بے روزگار ہیں بے روزگاروں کی تعداد میں 1991ء میں جنگ خلیج کے دوران خاص طور سے بہت اضافہ ہوا کیونکہ امیر عرب ممالک میں کام کرنے والے تقریباً 3 لاکھ اردنی لوگوں کو اپنے وطن لوٹنا پڑا تھا۔ اس اچانک بے روزگاری سے بھی حکومت پر زبردست دباؤ پڑا۔ حکومت تسلیم کرتی ہے کہ اچھے خاصے لوگ غربت کی لائن سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق غرباء میں سے 5 فیصد سے زیادہ انتہائی غریب اور 18 فیصد سے زائد صرف غریب ہیں۔ انتہائی غریب خاندان کی ماہانہ آمدنی تقریباً 87 ڈالر اور غریب خاندان کی 169 ڈالر ہے جو ظاہر ہے ایک پورے خاندان کی گزر بسر کے لئے انتہائی ناکافی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ غرباء کی اکثریت ان فلسطینیوں پر مشتمل ہے جو پناہ گزیں کیمپوں میں رہتے ہیں۔ یہ اب تک شاہ کے بوجوہ حامی و احسان مند رہے ہیں لیکن بدلتے حالات میں وہ ان سے کٹ کر اسلامی حزب اختلاف کا ساتھ دیکر ایک مدت سے حکمرانی کر رہے شاہ حسین کے لئے مسئلہ پیدا کر سکتے ہیں۔

انسانی حقو[ق]
امریکہ کے ہاتھ[...]
ایک موثر ہتھیار

امریکہ کے سفارتی محاذ پر انسانی حقوق کا معاملہ ایک طاقتور اسلحہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ امریکہ کی

اس شمارے کی قیمت چار روپے
سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپے / سو امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
الفا آفسیٹ پریس سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز، 49 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا۔
فون: 6827018

کویت میں امریکہ کی مقبولیت کا بُت پاش پاش ہو رہا ہے

کبھی امریکی پرچم لے کر رقص کرنے والے کویتی نوجوان آج امریکہ سے نالاں کیوں ہیں؟

4سال قبل جب امریکہ نے 33اقوام کی افواج کی قیادت کرتے ہوئے کویت سے عراقی فوج کو نکال باہر کیا تھا، اس وقت کویتی عوام خصوصا نوجوانوں نے امریکہ کو اپنا آئیڈیل بنالیا تھا۔ سڑکوں پر امریکی پرچم ہاتھ میں لے کر رقص کرتے ہوئے کویتی نوجوانوں کے دلوں میں اس وقت امریکہ کے لئے تعریف اور احسان مندی کے جذبات کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن آج چار سال بعد وہ جوش وجذبہ باقی نہیں رہا ہے۔

امریکی لباس، کاریں، امریکی میوزک، ان کے فیشن، رہن سہن کے انداز آج بھی کویتی عوام خصوصا نوجوانوں میں مقبول ہیں۔ سابق صدر بش کی تصاویر بھی آفسوں اور گھروں میں آویزاں نظر آتی ہیں۔ لیکن حالیہ دنوں میں کویتی عوام کی ایک روز افزوں اقلیت امریکہ سے عرب، اسرائیل امن کے مسئلہ کو لے کر ناراض ہوتی جارہی ہے۔ انہیں خاص طور سے اس امر کی شکایت ہے کہ امریکہ اس علاقے میں ایک ایسا امن قائم کرنا چاہتا ہے کہ جس سے صرف اسرائیل کو فائدہ پہونچے گا۔ بعض تو برملا امریکہ کے اخلاص پر شبہ کرنے لگے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ واشنگٹن کویتی تیل اور دولت میں دلچسپی رکھتا ہے نہ کہ اس کی سماجی سیاسی اور معاشی صحت میں۔

ایک نظریہ، جو کویت میں تیزی سے بڑھ رہا ہے یہ ہے کہ واشنگٹن کے اشارے پر عراق نے کویت پر قبضہ کیا تھا تاکہ بعد میں اسے وہاں سے باہر کرکے کویت کے تیل کے ذخائر کو وہ اپنے کنٹرول میں لاسکے۔

ایک 26 سالہ بیوروکریٹ ولید الفضلی کا کہنا ہے کہ "امریکہ حفاظت کے نام پر پیسہ بنارہا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں صدام حسین ان کا ایجنٹ ہوسکتا ہے"۔

> ایک نظریہ، جو کویت میں تیزی سے بڑھ رہا ہے یہ ہے کہ واشنگٹن کے اشارے پر عراق نے کویت پر قبضہ کیا تھا تاکہ بعد میں اسے وہاں سے باہر کرکے کویت کے تیل کے ذخائر کو وہ اپنے کنٹرول میں لاسکے۔ ایک 26 سالہ بیوروکریٹ ولید الفضلی کا کہنا ہے کہ "امریکہ حفاظت کے نام پر پیسہ بنارہا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں صدام حسین ان کا ایجنٹ ہوسکتا ہے"۔

کویت یونیورسٹی میں علم سیاست کے استاد اور پارلیامنٹ کے سیاسی مشیر عبداللہ الشائجی کے مطابق ادھر امریکہ وکویت کے خصوصی تعلقات میں پہلے جیسی گرمجوشی باقی نہیں رہی ہے۔ عوامی سطح پر اب بھی امریکہ کو زبردست حمایت حاصل ہے۔ مگر پڑھے لکھے نوجوانوں کا ایک طبقہ برملا امریکی پالیسیوں کی تنقید بھی کرنے لگا ہے۔ یہ تنقید خصوصا اس وقت زیادہ سخت ہوتی ہے جب کویتی اسرائیل۔ عرب تعلقات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ امریکی دباؤ کے تحت کویت نے ان کمپنیوں سے تجارت پر سے پابندی ہٹادی ہے جو اسرائیل کے ساتھ تجارت کرتی تھیں مگر یہودی ریاست سے براہ راست تجارت پر اب بھی پابندی عائد ہے کویت کا کہنا ہے کہ وہ یہ پابندی اسی وقت ہٹاسکتا ہے جب کہ عرب لیگ اس کا فیصلہ کرے

کویت کی وزارت خارجہ نے جنوری کے مہینے میں اسرائیل پر فلسطینیوں کے اس سرفروشانہ حملے کی جب مذمت کی جس میں 21 فوجی ہلاک ہوگئے تھے تو بعض ممبران پارلیامنٹ نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ چونکہ دوسرے عرب ممالک کی طرح خود کویت کے اندر اسلام پسند عناصر موجود ہیں اس لئے کویتی حکومت کوئی ایسا قدم اٹھانے سے ڈرتی ہے جس سے یہ تصور ابھرے کہ یہ خلیجی ریاست واشنگٹن سے سب سے زیادہ قریب ہے بعض کویتی افسران یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکہ کو کویت کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اس پر بہت زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے کویتی حکومت کے اندرونی وباہری مخالفین کو شہ ملے گی۔

کویت نے گذشتہ چار سالوں میں اپنی تعمیر نو پر تقریبا 50 بلین ڈالر خرچ کیا ہے جس کا اچھا خاصا حصہ امریکی خزانے میں گیا ہے۔ بہت سے کویتی اب یہ کہنے لگے ہیں کہ امریکہ دراصل کویتی دولت میں دلچسپی رکھتا ہے اگرچہ کویت کی سرحد کے قریب عراقی فوجوں کے اجتماع سے پیدا شدہ "موہوم خطرات" کو ٹالنے کے لئے امریکہ نے جس طرح فوراً کویت کی آواز پر لبیک کہا اس سے کویتی عوام کے اس یقین کو تقویت ملی ہے کہ امریکہ بہر حال ان کی حفاظت کرے گا۔ مگر اسی کے ساتھ بہت سے لوگ سازش کے نظریے میں بھی یقین کرنے لگے ہیں۔

ایک امریکی سفیر سے ایک کویتی وزیر محو گفتگو

کویت یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد عبداللہ النفیسی کا کہنا ہے کہ علاقائی عدم استحکام امریکہ کو یہ موقع فراہم کرتا رہے گا کہ وہ کویت کو اپنے ہتھیاروں کا خریدار بنائے رکھے۔ کویت نے پہلے ہی سنہ 2003ء تک ہتھیار خریدنے کے لئے 12 بلین ڈالر کی رقم مختص کردی ہے جس کا بڑا حصہ ظاہر ہے امریکہ کے حصے میں آئے گا۔

سیاسیات کے ایک دوسرے استاد شفیق الغابرہ نے کویتی عوام کو آگاہ کیا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ امریکہ ہمیشہ اسی طرح ان کا ساتھ دیتا رہے گا۔ "جو کچھ 91ء میں کیا گیا تھا اس کا تعلق مفادات سے زیادہ اور محبت ونفرت کے جذبات سے کم تھا۔ اور جس وقت بھی امریکہ یہ محسوس کرے گا کہ کویت سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہیں رہا ہے تو وہ اسے آسانی سے بھول جائے گا"۔ الغابرہ کی اس رائے میں کافی وزن ہے اور دھیرے دھیرے بہت سارے کویتی اس بات پر یقین کرنے لگے ہیں۔

●

...ق کا معاملہ

...یں

...زارت خارجہ نے اس معاملے کی آڑ میں ہندوستان ...ور چین جیسے ممالک کو پریشان کرنے کا ایک بہانہ ڈھونڈ لیا ہے۔ انسانی حقوق کے معاملے پر گذشتہ دنوں منظر عام پر آنے والی امریکہ کی "کنٹری رپورٹ آن ہیومن رائٹس پریکٹسز فار 94" پر ہندوستان اور چین نے اپنا احتجاج بھی درج کرایا ہے۔ پندرہ سو صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ گذشتہ دنوں امریکی وزارت خارجہ نے کانگریس کو پیش کی ہے۔ امریکہ کو چھوڑکر تقریبا تمام ممالک میں انسانی حقوق اور ان کی خلاف ورزی پر اس رپورٹ میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے مغربی حلیفوں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور کناڈا میں انسانی حقوق کی صورتحال پر اعداد وشمار پیش کئے گئے ہیں یہ بات الگ ہے کہ وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا ذکر ہلکے انداز میں کیا گیا ہے۔

گذشتہ سال صدر بل کلنٹن نے چین کے انسانی حقوق کو تجارت سے جوڑ دیا تھا۔ پہلے تو چین نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی لیکن پھر حیرت انگیز طور پر امریکہ سے سمجھوتہ کرلیا۔ چین نے امریکہ کے کسٹم افسران کو چینی جیلوں کا جائزہ لینے کی دعوت دی اور مبینہ طور پر امریکہ میں چینی سامان بھی برآمد کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس معاہدے

باقی صـ۴ـ پر

خوش قسمتی سے لیسن عرب نہیں تھا ورنہ....

انگریزوں کے مایۂ ناز بیئرنگ بینک کے دیوالیہ ہونے کی داستان

چند سال قبل جب بی سی سی آئی یا (بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل) اپنے بعض اہلکاروں کی غلطی کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا جس سے اس میں پونجی لگانے والوں کا کافی نقصان ہوا تھا تو پوری مغربی دنیا عربوں اور مسلمانوں کے خلاف چیخ اٹھی تھی۔ نہ صرف بی سی سی آئی کے ذمہ داروں کو برا بھلا کہا گیا بلکہ اس کی آڑ میں تمام عربوں اور ان کی تہذیب ومذہب اور دولت کو بھی نشانہ تنقید وتضحیک بنایا گیا تھا۔ لیکن بینکنگ کی تاریخ کے ایک تقریباً اتنے ہی بڑے گھٹالے کو دبانے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ اسے محض ایک شخص کی غلطی قرار دیا جارہا ہے اور اس کی آڑ میں اس کے مذہب وتہذیب اور نسل پر کیچڑ نہیں اچھالا جارہا

اخباری رپورٹوں کے مطابق 28 سالہ نک لیسن جو دو سو سال پرانے بیرنگ بینک کی سنگاپور برانچ کا منیجر تھا، نے 27 بلین ڈالر کے شیئر اور بانڈ کی موہوم خرید وفروخت میں اپنے بینک کا ایک بلین ڈالر کا نقصان کر دیا جس کی وجہ سے بینک کو بند کرنا پڑا ہے۔ لیسن نے جس بڑی رقم کی جوئے بازی کی یعنی 27 بلین ڈالر وہ دنیا کے کتنے ہی ممالک کے بجٹ سے زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لیسن کا جرم معمولی نہیں ہے اور نہ ہی ایک بلین ڈالر کی رقم معمولی ہے جس کا نقصان اس کے بینک کو اٹھانا پڑا ہے۔

عربوں اور مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ لیسن ان کے مذہب وتہذیب سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ اسکینڈل اب تک سنگین سیاسی ونفسیاتی رخ اختیار کر چکا ہوتا۔ اسے "برے عرب" کی ایک دوسری مثال بنا کر پیش کیا جاتا۔

بی سی سی آئی اسکینڈل کو یورپ وامریکہ میں کس طرح دیکھا گیا اور اس سے کس طرح نمٹا گیا سب کو معلوم ہے۔ اس کا سارا الزام بینک کے مالکوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے بینک کے بند ہونے سے

لیسن کو گرفتار کر کے لے جایا جارہا ہے

مالکان کا بھی کافی نقصان ہوا تھا مگر اس کے باوجود کھاتہ داروں کی رقم انہیں واپس کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے بی سی سی آئی کے سارے اثاثے اور عمارتیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اب دیکھنا ہے کہ بیئرنگ کے گھٹالے میں مغرب کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ کیا بیئرنگ کے مالکوں کو کھاتہ داروں کے نقصانات کو پورا کرنے کے لئے کہا جائے گا

بیئرنگ ایسا بینک نہیں ہے جس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اسی طرح بی سی سی آئی کی طرح یہ کوئی کم تجربے والا نیا بینک بھی نہیں ہے۔ یہ دراصل دو سو سال پرانا تجارتی بینک ہے۔

بینک کے بڑے افسران (دی فائننشیل ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق اس گھٹالے کی سنگینی یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ایک شخص کی غلطی اور بیوقوفی ہے۔ لیکن یہ محض حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اس گھٹالے میں صرف ایک نہیں بلکہ بہت سے افراد شامل ہیں۔ مثلاً مانیٹر کرنے والے افسران اور

منسلکہ بینکوں کے حکام، جن میں بینک آف انگلینڈ سر فہرست ہے، انہیں بھی لیسن کے ساتھ مورد الزام ٹھہرایا جانا چاہئے۔ بی سی سی آئی اسکینڈل کے معاملے میں بھی مغرب نے انتہائی ڈھٹائی سے بینک کے اکاونٹس کو آڈٹ کرنے والے ادارے کو الزام سے بری کر دیا تھا حالانکہ بینک کے آپریشن پر نظر رکھنا براہ راست اس کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح بی سی سی آئی کے معاملے میں مانیٹر کرنے والے افسران کو بھی بری الذمہ کر دیا گیا تھا۔ سارا الزام بینک کے مالکان اور اس میں پونجی لگانے والوں پر رکھ دیا گیا تھا۔

لیکن اس اسکینڈل میں کوشش کی جارہی ہے کہ اسے محض فرد واحد کی حماقت قرار دے دیا جائے۔ اور اس طرح بیئرنگ اور دوسرے منسلکہ مالی اداروں کو بینک کو گرانے، ختم کرنے یا دیوالیہ کرنے کے الزام سے بری کر دیا جائے تاکہ اسے لوگوں کے نقصانات ادا نہ کرنے پڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ پورا مغربی پریس نک لیسن کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نوجوان شخص نہایت مغرور اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار تھا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس کا حساب کمزور تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مان لیا یہ ساری باتیں صحیح ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مغرور اور نااہل شخص کو پھر ایک بڑے عہدے پر فائز کر کے ایک ایسے بڑے کام کی ذمہ داری سونپی ہی کیوں گئی جس میں کئی بلین ڈالر کا سودا شامل ہو۔ اسی طرح مانیٹر کرنے والے اداروں کی اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کو بھی قانوناً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بیئرنگ بینک کے ایک افسر کا کہنا ہے کہ 27 بلین کی جوئے بازی والے آپریشن کی اطلاع اسے کچھ عرصے سے تھی لیکن وہ اس ضمن میں کچھ اس لئے نہیں کر پایا کہ وہ بینک کی گذشتہ سال کی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ مگر یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کیونکہ مانیٹرنگ ایک سدا جاری رہنے والا کام ہے نہ کہ ایسا کام جسے دوسرے کاموں سے فرصت ملنے پر یوں ہی رواروی میں کر دیا جائے۔ کسی بینک کے آپریشن میں غلطیاں اتفاقاً نہیں پکڑی جاتیں بلکہ ایسا کسی مستقل اور منظم مشاہداتی نظام کے تحت ہوتا ہے۔ آڈٹ اور مانیٹرنگ کے شعبے ہر بینک میں اسی مقصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں۔

بیئرنگ اسکینڈل سے کئی سوال ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ کیا ایک بینک کے پورے آپریشن کو ایک شخص یا اہلکار کی "اچھی نیت" اور صوابدید پر منحصر ہونا چاہئے؟ کیا اس سے زیادہ کی امید نہیں ہونی چاہئے؟ سچ تو یہ ہے کہ ایسے قوانین بنائے جانے چاہئیں جن سے دوسروں کی رقم سے متعلق خطرہ (Risk) بعض حدود کے اندر ہی لیا جائے۔ مثلاً جو ایجنسی اکاونٹس کو آڈٹ کرتی ہے اسے مالی اداروں یا بینکوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی ذمہ داری بھی سونپی جائے تاکہ کسی بھی اسکینڈل کے معاملے میں اسے بھی نقصان میں سے ایک حصہ برداشت کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ اسی طرح کسی اسکینڈل کی صورت میں مانیٹر کرنے والے ادارے یا افسران کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جانا چاہئے۔ کیونکہ جب تک آڈٹنگ اور مانیٹرنگ کی ایجنسیوں کو بھی قانوناً ایسے متوقع جرائم میں ملوث قرار نہیں دیا جائے گا وہ محنت اور ایمانداری سے اپنا فرض پورا نہیں کریں گی۔

فرانس میں سی آئی اے کی جاسوسی سے متراں حکومت ہل اٹھی

فرانس میں جاسوسی میں ملوث امریکی سفارت کاروں کا راز فاش ہو جانے سے فرانسیسی حکومت پر نکتہ چینی کا باب کھل گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات اب مزید پردہ خفا میں نہیں رہ سکتے۔ ابھی تک فرانسیسی سیاسی مبصرین ایسے کسی واقعے کی تاک میں رہنے کو تضیع اوقات تصور کرتے تھے لیکن حالیہ چند ہفتوں کے دوران فون ٹیپنگ اور بڑے پیمانے پر جاسوسی کے واقعات کے انکشافات نے انہیں اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ وزیر اعظم اڈوآرڈ بالاڈوز کو اپنے وزیر داخلہ جیمس پاسکا کی زبان کو لگام دینی پڑے گی۔

یہ سارا معاملہ اس وقت منظر عام پر آیا جب فرانسیسی روزنامہ لاموند نے وسط فروری میں فرانسیسی حکومت کی طرف سی آئی اے کے پانچ ایجنٹوں کو ملک سے واپس بھیجنے کا مطالبہ کیا۔

لاموند نے جو انکشافات کئے وہ دوست ممالک کے درمیان عام طور پر ہوتے رہتے ہیں ان کے تجارتی، صنعتی اور سیاسی رازوں کی جاسوسی چلتی رہتی ہے اور ان کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر کسی حکومت کو دوسرے کی حرکت پر اعتراض ہوتا ہے تو وہ اس کی تشہیر کئے بغیر اپنے جاسوسوں کو اپنے ملک سے ہٹا لینے کو کہہ دیتی ہے۔

جن پانچ امریکی جاسوسوں کو فرانس چھوڑنے کا حکم ہوا ان پر بھی ایسی ہی سیاسی، صنعتی اور تجارتی جاسوسی کا الزام تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ امریکی مفادات کے حصول میں خصوصاً سمعی بصری ٹیکنولوجی پر مذاکرات میں فرانس کی حیثیت اور اس کی خارجہ پالیسی کا خاصا اہم کردار رہے گا۔ سی آئی اے پر الزام ہے کہ اس نے فرانسیسی وزیر اعظم کے ایک مشیر اور وزارت ثقافت کے ایک اور عہدیدار کی خدمات اپنے مفادات کے لئے حاصل کیں جس کی تحویل میں کیبل سیٹلائٹ اور مواصلات کے شعبے تھے۔ یہ دونوں گرگے فرانسیسی جاسوسی محکمے ڈی ایس ٹی سے وابستہ تھے جو 92 سے سی آئی کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ حلیفوں کے درمیان جاسوسانہ مہموں کا پردہ اگر فاش ہوتا ہے تو عموماً وزارت داخلہ کی سطح پر جس نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فرانسیسی اقدام امریکہ میں فرانسیسی ایجنٹوں کے خلاف کی گئی کارروائی کا رد عمل ہے۔ مزید یہ کہ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ وزیر داخلہ چارلس پاسکا نے فون ٹیپنگ اسکینڈل سے پیدا شدہ مسائل کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے یہ خبر گرم کی ہے۔ لاموند میں شائع ہونے والی تفصیلی رپورٹ کی تصدیق وزیر اعظم بلادور نے اشاروں کنایوں میں کی ہے۔

امریکی سفیر مسز ہیری مان کو پاسکا نے اواخر جنوری میں طلب کر کے یہ بتایا کہ مبینہ پانچ ایجنٹوں کی موجودگی فرانس میں اب اور برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس کی تصدیق موصوفہ کو بھیجے گئے اس مراسلے سے بھی ہوتی ہے جس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ اس معاملے میں امریکی حکومت کو آگاہ کر دیا گیا ہے جو عنقریب موزوں جواب دے گی۔ دو ہفتوں کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے پاسکا نے دوبارہ امریکی سفیر کو بلا کر اس معاملے کو نمٹانے کا مطالبہ کیا۔

روزنامے کی رپورٹ کے مطابق مبینہ پانچ ایجنٹوں میں سے تین اب بھی سفارت خانے کے عملے میں ہیں جن میں سے ایک کو فرانس کے اندر سی آئی اے کی جملہ سرگرمیوں کا سربراہ بتایا جاتا ہے اسے آج بھی ایک سکریٹری کی خدمات حاصل ہیں۔ اور ایک خاتون ایجنٹ نے گیٹ مذاکرات سے متعلق بعض مخصوص اطلاعات کی فراہمی کے عوض ایک فرانسیسی عہدیدار کو رقم پیش کی۔ واضح رہے کہ گیٹ مذاکرات سے متعلق 93 میں فرانس اور امریکہ کے درمیان تنازعے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ فرانس نے گیٹ معاہدے سے زرعی اقدامات اور یوروپی فلموں کو مستثنیٰ کروانے کے لئے جان توڑ کوشش کی تھی فرانس کی مجوزہ ترمیمات اسے کثیر، اضافی مقدار میں پنیر، تمباکو اور گیہوں برآمد کرنے کا موقع فراہم کرتیں لیکن اس کی سب سے بڑی جیت یوروپی فلموں کو گیٹ کے دائرہ اثر سے محفوظ رکھنے میں تھی کیونکہ اس طرح وہ اپنی سینما انڈسٹری کو برابر امدادی راحت بہم پہنچا سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ڈی ایس ٹی کے پاس امریکی ایجنسیوں کے خلاف لگائے گئے الزامات کی تصدیق کے لئے وافر ثبوت موجود ہیں مثلاً فرانسیسی عہدیداروں سے ان کی ملاقاتوں کی تصویریں، فرضی ناموں سے ہوٹل کے رجسٹروں اور کریڈٹ کارڈ پر دستخط اور پانچ سو فرینک کے نوٹوں کے نمبر جو فرانسیسی عہدیداروں کو دیئے گئے۔ سی آئی اے کے ذمہ داروں نے ذاتی طور پر فرانسیسی الزامات کی توثیق ان الفاظ میں کی کہ وہ معقول حد تک درست ہیں۔ تاہم ان ذمہ داران نے مزید کسی وضاحت سے انکار کیا۔

سی آئی اے کے لئے حلیف ممالک کی اس طرح جاسوسی کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سوویت جاسوس امس کے معاملے کے سامنے آنے کے بعد سے سی آئی اے امن وتحفظ اور تجارتی مفادات سے متعلق معاملات پر پہلے سے کہیں زیادہ خرچ کر رہی ہے۔

مسلمانوں کے غم میں گھلنے والے اور انہیں سدھارنے کی کوشش کرنے والے

برادران وطن پہلے اپنے گھر کی فکر کریں

تحریر : —— سلطان شاہین

یہ کالم ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مسلم و غیر مسلم دانشوروں کے مضامین کے لئے وقف ہے۔ اس میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ایڈیٹر)

ایک زمانہ تھا جب میں ایک ایسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا جس کی نگاہ غلط انداز کا بھی میں گنہ گار نہیں ہوں۔ میں اس پر جتنی جان چھڑکتا وہ مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی۔ ادھر میں اس کا مشتاق ادھر وہ مجھ سے بیزار۔ کئی سالوں تک ناکام محبت کا تجربہ اٹھا چکنے کے بعد ہندتو کے ٹھیکیداروں کے انجام پر ترس کھانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندتو کے حامیوں کو مسلمانوں خصوصا مسلمان عوتوں سے بڑی ہمدردی اور محبت ہے۔ اس تعلق کی صداقت پر شبہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ان کا جذبہ اور انہیں اچھا مسلمان، اچھا ہندو، اچھے ماں باپ ہندستانی زندگی کے قومی دھارے میں شریک ہونے والے عقلیت پسند اور جدید ذہن کے حامل شہری بنانے کی ان کی شدید خواہش اسی جذبہ محبت اور تعلق خاطر کا ہی تو نتیجہ ہے۔ ورنہ ان مجتوں کی اصلاح کے طریقے ڈھونڈھ نکالنے کے لئے کون اپنی راتیں سیاہ کرتا۔

لیکن افسوس کہ میری نوخیز محبت کی طرح ہندتو کے حامیوں کی محبت کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ صد افسوس کہ ان کے صالح جذبے کو سمجھنے کی بھی کوشش نہ کی گئی۔

مسلمانوں کو سدھارنے کی جس شدومد سے وہ کوشش کرتے ہیں اسی شدت سے مسلمانوں کی طرف سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے اور آخر ہندتو پرستوں کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ مفسد عناصر پہلے خود اپنے گھر کو درست کیوں نہیں کرتے؟ وہ آر ایس ایس سے کیوں نہیں کہتے کہ یوم جمہوریت کے موقع پر اپنے ہیڈکوارٹر پر قومی پرچم لہرائے۔ وہ اپنی دلہنوں اور بیواؤں کو جلانا کیوں نہیں ترک کرتے؟ وہ دلتوں کو انسان سمجھنا کیوں نہیں شروع کرتے؟ پاکستان کے لئے جاسوسی کرنے والے لوگ ہند ہوتے ہیں۔ اپنے ملک کی معیشت کو تباہ کرنے کے درپے بدعنوانی افراد ہندو ہی ہیں۔ ہندتو کی تمام تنظیموں کے چوتھے اور پانچویں درجے کے کارکنان تک نے بے شمار دولت جمع کرلی ہے۔ ان کی اصلاح کیوں نہیں کی جاتی؟ جب کوئی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندتو پرستوں کی پیروی کرنے اٹھتا ہے تو اسے بعض اسی قسم کے سوالات سننے پڑتے ہیں۔

کتنی احسان فراموشی کی بات ہے۔ بجائے شوری اور کامتھ جیسے لوگ خود اپنے فرقے کو درپیش مسائل کو پس پشت ڈال کر ہم مسلمانوں کو اس سماج سے جس میں ہم رہتے ہیں بہتر طریقے پر ہم آہنگ کرنے، زیادہ بااحترام اور ذمہ دار بنانے اور درحقیقت اپنے ملک مولود میں درجہ اول کے شہری بنانے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں اور مسلمان ہیں کہ انہیں طرح طرح کے ناموں سے نواز رہے ہیں۔ گویا محبت کا بدلہ بے وفائی سے مل رہا ہے اور اصلاح کا جذبہ بیگی کے دریا میں ڈال کر صحیح تعبیر پیش کررہا ہے۔

ناکام محبت کی غالبا یہ کلاسیکی مثال ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بیشتر موقعوں پر میری ماں انتظار کرتی رہ جاتی تھی کہ کب میں جیری ہوئی لکڑیاں اور سوکھی پتیاں لے کر گھر لوٹوں تو وہ چولہے میں آگ جلاکر رات کا کھانا پکائے اور میں تھا کہ ماں اور بہن کی بھوک پیاس سے یکسر غافل اپنی محبوبہ کے گھر کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔

لیکن ہندتو پرستوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ناامیدی کی ایسی نوبت نہیں آئی ہے۔ ان کے کند ذہن سامعین کی موٹی کھال میں ان کے بعض خیالات کا گزر ہوچکا ہے۔

بعض مسلمانوں کو ان کی طویل مسلسل اور احمقانہ پرجوش تقریروں کے تئیں احسان مندی کا احساس ہونے لگا ہے۔ نیم سیکولرزم کی ہی مثال لے لیجئے۔ جب ہندتو پرستوں نے اس اصطلاح کو کانگریسی سیکولرزم کی وضاحت کے لئے عام کیا تو مسلمانوں نے اتنے ذوق وشوق سے اس کا استقبال کیا کہ جس کا تصور محال ہے۔ اب عملاہر مسلمان کانگریس کو نیم سیکولر ہونے کا الزام دے رہا ہے۔ ہندتو پرستوں کے انکشافات اور وعظ و نصیحت کے زیراثر مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت پر انگشت نمائی شروع کردی ہے۔ انتخابات سے پہلے کے فتوؤں کی کوئی قدر وقیمت ہی نہیں رہ گئی۔

کیا ہندتو کی جنگ پسندی ہندو فرقہ کی جنگ پسندی کی نمائندگی کررہی ہے۔ یقینا ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح نام نہاد مسلم قیادت کی عناد پرستی مسلم فرقہ کی عناد پرستی کی نمائندہ نہیں ہے۔ شاید ابھی بہت تاخیر نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی یہ ممکن ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل وسیع اکثریت سے رابطہ قائم کرنے کی راہیں نکالی جائیں جو دوسرے کی جائداد پر تنازعہ کھڑا کرنے کے بجائے اپنے سامنے صالح مقاصد رکھتے ہوں۔

مسٹر کامتھ نے بڑے اطمینان سے حیدرآباد کے آرک بشپ اور لپا کا بیان نقل کیا ہے۔ جنھوں نے روزنامہ کرونیکل کی 27 اگست کی اشاعت میں شائع ایک انٹرویو میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ تہذیبی اعتبار سے وہ ہندو ہیں، قومی اعتبار سے ہندوستانی اور مذہبی اعتبار سے عیسائی۔ آرک بشپ کے نزدیک ہندوازم ایک کلچر ہے نہ کہ مذہب "ہمیں مذہب اور کلچر میں امتیاز کرنا چاہئے۔" بیشتر ہندوستانی مسلمان اس بات سے اتفاق کریں گے کہ تہذیبی اعتبار سے وہ ہندو ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ کس ملک کے مسلمان اتنے بے شرم اور اسلام کی طرف سے بے پرواہوں گے کہ اپنی منکوحہ سے جہیز کا مطالبہ کرتے ہوں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو وعدے کے مطابق جہیز دینے پر جلاتے نہ ہوں لیکن مسلم پرسنل لاء کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ انہیں سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ رحم کا یہ مظاہرہ اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے مقابلے میں کم خود غرض یا لالچی ہیں بلکہ اس لئے کہ مسلم قانون کے انسانیت پسند ضابطوں سے فائدہ اٹھانے کی انہیں اجازت ہے جس کے وہ حقیقتا مستحق نہیں ہیں۔

ہندوستان کے علاوہ آپ اور کہاں مسلمانوں کو ذات پات کے نظام پر کاربند دیکھیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ چھوا چھوت کے عارضہ سے وہ محفوظ ہیں۔ بے شک مسلمان تہذیبی اعتبار سے ہندو ہیں اپنے ہندو بھائی بہنوں کی طرح وہ بھی جھوٹ، دغا بازی، چوری، عصمت دری، قتل جیسے گناہوں اور جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن مقام شکر ہے کہ مسلمان بس ایک کام نہیں کرتے۔ یعنی وہ پاکستان کے لئے جاسوسی نہیں کرتے۔

آرک بشپ نے یہ واضح کرنے کے لئے لفظ کلچر کو خط کشیدہ کردیا ہے کہ وہ مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ ثقافتی اعتبار سے ہندو ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد مل جائے گی جو آپ کو بتا سکتے ہیں کہ قبل اسلام کی تعلیمات نبوی میں یقین ان کے مذہب کا جزو لازم ہے۔

اگر کوئی ہندو صدق دل سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ "ایکم ست" وپرا بہدا ودانتی" (حقیقت ایک ہی ہے دانا لوگ اسے مختلف ناموں سے جانتے ہیں) تو مسلمانوں کی غالب اکثریت کو ان الفاظ کو دہرانا چاہئے۔ ظلمت پسند ہندو تو یہ وعدہ کرسکتا ہے کہ اس کا مذہب الہامی حقیقت کا واحد نمائندہ ہے لیکن مسلمان یہ نہیں کرسکتے۔ مسلمان کے نزدیک اسلام مذہبی عمارت کی بلند آخری منزل ہے جس کی بنیاد ہندوازم جیسے قدیم فلسفوں پر رکھی ہوئی ہے۔ کوئی بیوقوف مسلمان ہی یہ سوچتا ہوگا کہ وہ اپنی مذہبی عمارت کی آخری منزل پر اس کی بنیادوں کو کھود کر یا اس سے انحراف کرکے سکون سے قیام کرسکتا ہے۔ اس کے لئے اسے نہ صرف اچھا مسلمان بلکہ اچھا ہندو، اچھا عیسائی اور اچھا یہودی بھی ہونا چاہئے۔

میں مسلمانوں کا قائد نہیں ہوں لیکن اگر مسٹر کامتھ کی نظر میں کسی معمولی مسلمان کی کوئی حیثیت ہے تو صوبوں سے مزعومہ اسلامی ناروا داری کے شکار ہندوؤں سے معذرت کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میری گزارش بھی ہے۔ یہ بات مجھے کوئی سمجھا دے کہ مسلمانوں اور خصوصا مغل حکومت نے ہندوؤں کا کیا بگاڑا تھا۔ اگر میری یادداشت خطا نہیں کررہی تو برطانوی سامراج کے خلاف ہماری جنگ کے دوران ہندوستان کے مختلف حصوں کے حکمرانوں نے ایک جٹ ہوکر اتفاق رائے سے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اپنا فرماں روا تسلیم کیا تھا جو عملی طور پر لال قلعہ میں، محصور ایک برطانوی قیدی سے زیادہ کچھ اور نہ تھے۔

انگریزی سے ترجمہ

بقیہ : انسانی حقوق اور امریکہ

کے نتیجے میں کلنٹن نے اپنی پالیسی بدل دی اور انسانی حقوق کو تجارت سے جدا کرکے تجارتی محاذ پر چین کی سابقہ پوزیشن کو بحال کردیا۔

تاہم امریکی انتظامیہ انسانی حقوق کے معاملے کو تجارت سے جوڑنے کو بے چین ہے امریکہ کے اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹس اور جمہوریت محنت اور انسانی حقوق کے انچارج جان شاٹوک کے مطابق انسانی حقوق اور تجارت کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم فیصلہ لیا جاناہے۔

اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے سروے میں ہندوستان میں 94 میں انسانی حقوق کی پامالی پر 24 صفحات مختص ہیں، جن میدانوں میں انسانی حقوق کی پامالی کی بات کہی گئی ہے وہ ہیں غیر عدالتی سزائے اموات، ٹارچر، کشمیر اور شمالی ہندوستان میں علیحدگی پسند تنظیم سے وابستہ افراد کا مسلح دستوں کے ہاتھوں قتل، سیاسی قتل، جنگ جوؤں کے ذریعے اغوا کاری اور معاوضہ کی رقوم کا مطالبہ، پنجاب میں پولیس کے ہاتھوں غیر عدالتی سزائے موت، پورے ہندوستان میں پولیس کی حراست میں خواتین کی عصمت دری اور مشتبہ افراد کا قتل اور ٹاڈا کے تحت بلاچارج شیٹ داخل کئے طویل مدت تک گرفتار شدگان کو حراست میں رکھنا۔ رپورٹ کے مطابق بمبئی میں فرضی انکاونٹروں میں لوگوں کو ماردینے کا سلسلہ عام ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ دہلی کی تہاڑ جیل میں صرف 2487 قیدیوں کو رکھنے کی سہولیات میں جب کہ وہاں 8577 قیدی بند ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں انسانی حقوق کی پامالی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امریکہ انسانی حقوق کے معاملے کو تجارت سے جوڑ دے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خود امریکہ کے ہاتھوں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ نیویارک ٹائمز کی ایک حالیہ رپورٹ میں اعداد وشمار کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ شمالی مریانا کے روٹا جزیرے میں امریکہ کے ہاتھوں انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر پامالی ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق گذشتہ کئی برسوں سے اس مقام پر امریکی شہریوں کے ذریعے انسانی حقوق روندے جارہے ہیں جس کی بنا پر یہ جگہ جہنم کا نمونہ پیش کررہی ہے۔ اس کے علاوہ امریکی افسران، انسانی حقوق کے وکلاء اور چرچ کے ذرائع کے مطابق ہوٹلوں میں کام کرنے والی خواتین کو جبریہ عصمت دری کے دھندے میں دھکیلا جاتا ہے اور ان کے فالتو اوقات میں انہیں کمروں میں بند کرکے ان سے جنسی تلذذ حاصل کیا جاتا ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی خواتین کو زدوکوب کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ منہ کالا کیا جاتا ہے اور غیر ملکی ملازمین کے ساتھ تنخواہوں کے معاملے میں دھوکہ دہی سے کام لیا جاتا ہے۔

امریکہ میں فلپینس اور چین کے شہریوں کا جسمانی اور جنسی استحصال کیا جاتا ہے اور مزدوروں کے حقوق مارے جاتے ہیں۔ ان سب کا ذکر امریکی انتظامیہ کو پیش کی گئی انسانی حقوق کی رپورٹوں اور حلف ناموں میں کیا گیا ہے۔ اس طرح نیویارک ٹائمز کی رپورٹ سے خود امریکہ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

"حکومت کے کاموں میں رخنہ اندازی برداشت نہیں کی جائے گی"

بقیہ: مہاراشٹر میں شیو سینا کی حکومت

نہیں ٹھہراتیں کیونکہ بقول ان کے اس وقت کانگریس برسر اقتدار تھی اور وہی ہو رہا تھا جو وہ چاہ رہی تھی۔

کرلا کے ایک کمرشیل آرٹسٹ مسیح اللہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے سکون ملا ہے کہ شیوسینا جیت لی ہے ہمارے علاقے لے بیشتر مسلمانوں نے تو شیوسینا ہی کو ووٹ دیا تھا تاکہ کانگریس کو ہرایا جاسکے۔ ہمارا خیال ہے کہ شیوسینا ہم لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گی۔ لیکن کیا سبھی لوگ ایسا سوچتے ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دینا مشکل ہے۔ کچھ اردو صحافیوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ شیوسینا اور بی جے پی نے بابری مسجد منہدم کی ہے اور ٹھاکرے سینہ ٹھونک کر اس پر فخر کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں اور وہ بمبئی کے فسادات کا بھی اعتراف کرتے رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اخبار "سامنا" میں اداریے لکھ کر شیوسینکوں کو اشتعال بھی دلاتے رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں شیوسینا سے انصاف کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ ہم یہ کیسے مان لیں کہ وہ ہمارے ساتھ زیادتی نہیں کرے گی اور موقع ملتے ہی ہم پر حملہ نہیں کرے گی؟

حلف برداری کی تقریب میں جو کہ پہلی بار راج بھون میں نہ ہو کر شیواجی پارک میں منعقد ہوئی تھی، بال ٹھاکرے، منوہر جوشی اور گوپی ناتھ منڈے کی تقریروں کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مسلمانان بمبئی کے خدشات غلط نہیں ہیں۔ ٹھاکرے نے پوار کے خلاف جو اشتعال انگیز تقریر کی وہ ان کے عزائم کو واشگاف کرنے کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے پوار کو دھمکی دینے کے علاوہ نام نہاد بنگلہ دیشی مسلمانوں کو مہاراشٹر چھوڑ کر بھاگ جانے کا بھی حکم دیا ہے۔ بصورت دیگر انہوں نے مسلمانوں کو مہاراشٹر سے بزور طاقت نکال دینے کی دھمکی دی ہے۔ پوار پر زبردست حملہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ منوہر جوشی کی جیت پر انہیں مبارکباد دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہندوتو کے پرانے معاملے کو لے کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر شیوسینا بی جے پی اتحاد کے ممبران کی تعداد کو کم کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ کون ہوتا ہے ہماری طاقت کمزور کرنے والا، اس کے پاس تو طاقت ہی نہیں ہے۔ اگر اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو مہاراشٹر میں آگ لگادی جائے گی اور وہ کہیں آنے جانے کے لائق نہیں رہ جائے گا۔

ادھر گوپی ناتھ منڈے نے ہندوتو اور اجودھیا کے ایشو کو زندہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم ہندوتو کو نہیں چھوڑ سکتے ہم نے بمبئی پر قبضہ کرلیا ہے اور اب ہمارے لئے دلی دور نہیں ہے۔ منوہر جوشی نے کہا کہ ہم سب کے ساتھ انصاف کریں گے البتہ منہ بھرائی اور اپیزمنٹ کسی کا بھی نہیں ہوگا (اقلیتوں کا بھی نہیں) دراصل مسلمانوں کی جائز مانگوں کو مان لینے کو یہ لوگ منہ بھرائی کہتے ہیں۔ اگر حکومت مسلمانوں کی بہبود کے لئے کوئی قدم اٹھاتی ہے تو وہ اسے مسلمانوں کے ساتھ بیجا لاڈ پیار سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اب مسلمانوں کی جائز مانگیں بھی نہیں مانی جائیں گی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی پروگرام بھی نہیں چلایا جائے گا۔

بال ٹھاکرے کی دھمکی

وزیر اعلی بننے کے بعد اپنی پہلی پریس کانفرنس میں منوہر جوشی نے کہا کہ اب نماز سڑکوں پر نہیں ہوگی اور مہا آرتی بھی نہیں ہونے دی جائے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے ٹریفک کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں سے گفتگو کروں گا۔ ان سے کہا گیا کہ اگر مسجدوں پر اضافی منزل بنانے کی اجازت دی جائے تو یہ مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اس پر گفتگو ہوسکتی ہے۔ سڑکوں پر نماز کی ادائیگی پر

> لوگوں میں یہ خوف پیدا ہوگیا ہے کہ شیوسینا غیر مہاراشٹرین شہریوں کو شاید وہ مراعات نہ دے جو مہاراشٹرین کو دیگی یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے "آمچی ممبئی" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہ غیر مراٹھا لوگوں کو ممبئی سے نکالنے کی کوئی مہم شروع کرے۔

پابندی کی دھمکی دینے کے علاوہ انہوں نے بمبئی اور دوسرے اہم شہروں کے نام بھی بدلنے کی بات کہی۔ بمبئی کو ممبئی اور اورنگ آباد کو سمبھاجی نگر بنانے کا وعدہ کیا۔ جوشی نے کہا کہ شہروں کے نام بدلنے پر قانونی ماہرین سے گفت وشنید کی جارہی ہے اور یہ معلوم کیا جارہا ہے کہ کیا ریاستی حکومت اس کی مجاز ہے؟ اگر جواب اثبات میں ملا تو جلد از جلد نام بدل دیے جائیں گے۔ ادھر بال ٹھاکرے نے بھی جارحانہ روش اختیار کرنے کا سگنل دے دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ناجائز دراندازوں کا پتہ لگانے کے لئے راشن کارڈوں کا جائزہ لیا جائیگا۔ اس سے لوگوں میں یہ خوف پیدا ہوگیا ہے کہ شیوسینا غیر مہاراشٹرین شہریوں کو شاید وہ مراعات نہ دے جو مہاراشٹرین کو دیگی یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے "آمچی ممبئی" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہ غیر مراٹھا لوگوں کو بمبئی سے نکالنے کی کوئی مہم شروع کرے۔ دوسری طرف ٹھاکرے نے دوسری پارٹیوں کو کسی بھی قسم کا مورچہ نکالنے یا مظاہرہ کرنے کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی دھمکی دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر کسی نے ایسا کرکے حکومت کے کاموں میں روڑہ اٹکانے کی کوشش کی تو اسے قطعی برداشت نہیں کیا جائے گا۔

گویا مہاراشٹر اب بال ٹھاکرے کی ڈکٹیٹرشپ کے شکنجے میں ہے۔ اگر کسی نے اس آمریت کے خلاف کوئی آواز اٹھائی تو اسے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑسکتا ہے۔ لیکن ٹھاکرے، جوشی اور منڈے کے ان جارحانہ بیانات سے اگر کسی کو بہت زیادہ تشویش ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں اور ممکن ہے کہ شیوسینا حکومت کا نزلہ سب سے پہلے مسلمانوں پر ہی گرے۔

بقیہ: بے نظیر کی امت مسلمہ سے غداری

مجاہدین کے شانہ بشانہ حصہ لے چکا ہے اور بم بنانے کی تربیت اس نے ضیاء دور میں پاک افغان سرحد پر قائم کردہ کیمپوں سے حاصل کی جن پر اس زمانہ میں امریکی سی آئی اے اربوں ڈالر خرچ کر رہی تھی۔ امریکن سی آئی اے کے مطابق رمزی دہشت گردی سے متعلق معاملات میں مکمل تکنیکی مہارت رکھتا ہے۔ نیویارک ٹریڈ سینٹر بلاسٹ کے اگلے ہی روز وہ عبدالباسط نام کے پاسپورٹ پر ٹکٹ کٹوا کر امریکہ سے فرار ہوگیا تھا۔ رمزی کو امریکہ کے حوالے کرنے کے پاکستانی حکومت کے فیصلہ کی کچھ مذہبی حلقوں نے شدید مذمت کی ہے۔ ان میں جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نمایاں ہیں انہوں نے حکومت پاکستان کے فیصلہ کو امت مسلمہ کے مفادات کے منافی قرار دیا ہے۔ تاہم حکومتی حلقوں کا موقف ہے کہ تنقید اس وقت جائز ہوتی جب رمزی پاکستانی شہری ہوتا۔ حکومتی ذرائع کے مطابق رمزی کو امریکہ کے حوالے کرنے سے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے 4 اپریل سے شروع ہونے والے دورہ امریکہ پر خوش آئند اثرات مرتب ہوں گے۔ رمزی کی گرفتاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی صدر کلنٹن کو نیند سے بیدار کرکے اس واقعے کی اطلاع دی گئی اور انہوں نے خود ٹی وی پر آکر اپنی قوم کو اس "خوشخبری" سے آگاہ کیا۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے نام شکریہ کے خط میں صدر کلنٹن نے کہا ہے کہ پاکستانی حکومت کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بین اقوامی دہشت گردی کے خلاف دونوں قوموں کا موقف ایک ہے۔ رمزی کو امریکا کے حوالے کرنے سے پاکستان پر مسلسل عائد کئے جانے والے انتہا پسندی اور دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزامات دھونے میں بھی بڑی حد تک مدد ملے گی۔

امریکن ایف بی آئی نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر بلاسٹ کو اسلامی انتہا پسندوں کی تخریب کاری قرار دیا اور خاص طور پر چار اسلامی ممالک پر شبہ کا اظہار کیا جن میں عراق، لیبیا، فلسطین اور ایران شامل تھے۔ اس ایجنسی کے خیال میں امریکہ کی عدالتوں میں اس وقت دہشت گردی کے الزامات کا سامنا کرنے والے شیخ عبدالرحمان اور ان کے دیگر گیارہ ساتھی بھی رمزی یوسف کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

رمزی کی گرفتاری کو امریکی حکومت کی طرف سے غیر معمولی اہمیت دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ کسی بڑے مشن پر تھا جس کا پورا ہونا امریکی مفادات کے لئے کسی بڑے نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔

امریکی ایف بی آئی کے مطابق دھماکہ میں ملوث ملزمان کی کل تعداد سات ہے جن میں سے چھ گرفتار ہو چکے ہیں۔ گرفتار شدگان میں فلسطینی حریت پسند محمد امین سلامہ، کویتی انجینئر ندال ایاز، مصری ٹیکسی ڈرائیور ابراہیم البیرونی، مصری امام مسجد شیخ عمر بن عبدالرحمان، امریکہ میں پیدا ہونے والا مسلمان محمد ابو حلیمہ اور یوسف رمزی شامل ہیں۔ ساتویں ملزم عبدالرحمان یاسین کے پاس عراق اور امریکہ دونوں کے پاسپورٹ موجود ہیں اور خیال ہے کہ وہ پاکستان یا عراق میں سے کسی ایک ملک میں روپوش ہے۔

ایف بی آئی کے ڈائریکٹر ولیم نے شاید ملزمان کی قومیتوں کے مد نظر اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ رمزی اور اس کے دیگر ساتھی خلیج کے اسلامی ممالک کی طرف سے مشترکہ طور پر سونپے گئے کسی بڑے مشن پر کام کر رہے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عراق، لیبیا، ایران اور فلسطینی اقوام امریکی سامراجیت کا نشانہ بنی ہیں۔ عراق پر حملے سے قبل امریکا نے صدر صدام کو عالمی دہشت گردی کا چمپیئن قرار دیا تھا اور اقوام متحدہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی اسلامی ملک کے خلاف ویٹو کا حق استعمال کرکے عراق پر حملہ کیا گیا۔

جنگ کے بعد صدر صدام نے اعلان کیا تھا کہ ہم امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف کسی بھی قسم کا قدم اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے صدر صدام کی یہ دھمکی امریکی حکام کے ان شکوک کو تقویت دیتی ہے کہ رمزی دراصل کسی عراقی مشن پر کام کر رہا تھا۔ ان کے خیال میں رمزی کی گرفتاری سے عراقی دہشت گردی کے اس جال کے اصل تانے بانے سامنے آئیں گے جو ابھی تک خفیہ ہے۔

اس پس منظر میں رمزی کی گرفتاری پر صدر کلنٹن کی حیرت اور خوشی کافی حد تک سمجھ میں آتی ہے۔ رمزی نے نیویارک کی ایک عدالت میں اقبال جرم سے انکار کیا ہے تاہم اس کا جو بھی انجام ہو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ امریکا عراق تنازعہ مستقبل میں مزید شدت اختیار کرے گا۔

مغرب کے ایوان اس خوف سے ڈھلے جاتے ہیں کہ

اسلام آرہا ہے، اسلام آرہا ہے

مغرب کی بیمار، خوف زدہ نفسیات کا ایک چشم کشا تجزیہ

سوویت یونین کے زوال کے بعد ہی سے مغرب کا عسکریت پسند طبقہ جس کا سب سے طاقور گروپ خود NATO کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہے، ایک نئے دشمن کی تلاش میں ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے فوراً بعد مغرب کا یہ عسکریت پسند طبقہ یہ تاثر دینے میں مصروف ہوگیا کہ کمیونزم کی جگہ اسلام اب مغرب کا دشمن ہے۔ لیکن جیسے ہی اس نوعیت کے بیانات و مضامین سامنے آئے ویسے ہی خود مغرب کے دانشوروں کے ایک گروپ نے اسے لغو قرار دے دیا۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ اکثر مسلم ممالک نہ صرف یہ کہ انتہا پسند نہیں بلکہ خود مغرب کے ہمنوا ہیں۔ اسی طرح چند ایک مسلم ممالک جو مغرب کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے مثلاً ایران وغیرہ وہ مغرب کے لئے کوئی خطرہ بننے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

مذکورہ دلائل کے بعد مغرب کے عسکریت پسند طبقہ نے دوسرا شوشہ چھوڑا۔ انہوں نے اس بار دنیا بھر میں کام کر رہی اسلام پسند تحریکوں کو ایک خطرے کے طور پر پیش کیا۔ یہاں انہیں کچھ کامیابی ملتی نظر آئی جس کے کئی اسباب ہیں۔

اول یہ کہ دنیا کے بعض مسلم و غیر مسلم ممالک میں مسلمان مسلح جدو جہد میں مصروف ہیں۔ کسی بھی مذہب و ثقافت کے ماننے والے ہوں، جب وہ کسی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو اس کے لئے اپنی تاریخ اور مذہب سے جذبہ حاصل کرتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں تحریک آزادی کے دوران گاندھی جی نے رام راجیہ کی بات کی تھی۔ مغرب کے عیسائی ممالک بھی اپنے سارے سیکولرازم کے باوجود دشمن سے جنگ کے وقت اپنی مذہبی و قومی تاریخ سے جذبہ حاصل کرتے ہیں۔ مگر ان حضرات کی اس حرکت کو "ہندو بنیاد پرستی" یا "عیسائی بنیاد پرستی" نہیں کہا جاتا۔ مگر جب کسی نظام کے خلاف اپنی جدو جہد میں مسلمان اپنی تاریخ و مذہب کا سہارا لیتا ہے تو اسے "اسلامی بنیاد پرستی" کا نام دیکر دنیا کے لئے ایک خطرہ تصور کیا جانے لگتا ہے۔

دوم یہ کہ خود مسلم ممالک کے مغرب نواز حکمرانوں نے بھی، اپنے رویہ میں تبدیلی کرنے کے بجائے، اسلامی بنیاد پرستی کو خطرے کے طور پر پیش کیا۔ اسکے دو مقاصد تھے۔ اس نام نہاد خطرے کی آڑ میں اپنے خلاف جاری اپوزیشن تحریکوں کو کچلنا جس کے لئے اکثر اذیت رسانی کے ایسے طریقے اختیار کئے جن سے حقوق انسانی کی پامالی کے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ دوسرا مقصد مغرب کو یہ جتانا تھا کہ اگر ان کی معاشی و فوجی مدد نہ کی گئی تو اسلام پسند ان کے اقتدار کا تختہ الٹ کر مغربی مفادات کے لئے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ نااہل اور جابر مسلم حکمرانوں کی یہ ناپاک تدبیر بڑی کامیاب رہی ہے۔ مغرب کے عسکریت پسندوں نے اپنی انتہا پسندانہ پالیسیوں کے جواز کے لئے ان مسلم حکمرانوں کے بیانات و خیالات کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔

مغرب کے یہ عسکریت پسند صرف ان کی فوج اور ان سے منسلک اداروں ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ خود صحافت کے میدان میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے نام نہاد پیشہ ورانہ فرض کو نبھانے کے نام پر در اصل مغرب کے انہیں عسکریت پسندوں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خدمت حال میں ایک انگریز اور مسلمان صحافی نے مشترکہ طور پر انجام دی ہے۔ دہلی میں موجود جان وارڈ اینڈرسن اور کراچی کے کامران خان نے Zurich سے شائع ہونے والے انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون کی 10 مارچ کی اشاعت میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں یہ دکھانے یا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان و افغانستان میں بعض گروپ سعودی عرب کی "اپوزیشن" کی مدد سے ایک مسلح گروپ تیار کر رہے ہیں۔ جسکا مقصد ایک "عالمی اسلامی ریاست" قائم کرنا ہے۔

اس رپورٹ کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ پاکستان 1990ء کی دہائی کے آغاز ہی سے مسلح اسلام پسندوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ "در اصل یہ وہ وقت ہے جب بنیاد پرست گروپ اور ہزاروں مجاہدین، جو افغانستان میں روسی فوجیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے، نے اپنے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے نئے جہاد کی تلاش شروع کر دی تھی۔" ان افتتاحی کلمات کے بعد رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بعض گروہ پاکستان و افغانستان میں مسلم نوجوانوں کو جہاد کی تربیت دے رہے ہیں۔ مثلاً رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر مہینے کی تیسری جمعرات کو کراچی کے ایک مقام سے ایک بس 2 درجن افراد کو لیکر تقریباً ایک ہزار میل کی مسافت طے کر کے افغانستان میں کسی خفیہ مقام پر جاتی ہے جہاں یہ افراد اگلے چالیس دنوں میں ایک عالمی مقدس جنگ کے لئے بنیادی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

> اس میں شک نہیں کہ چند جذباتی نوجوانوں نے ہتھیار اٹھالیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور فلپائن میں مسلمانوں پر مظالم کا نتیجہ ہے نہ کہ اس اسلامی بنیاد پرستی کا جسے مغرب اپنے مفاد کے پیش نظر ایک ہوا بنا کر پیش کر رہا ہے۔ "اسلامی بنیاد پرستی" کا خطرہ در اصل مغرب کا اپنا پیدا کردہ ہے۔

یہ خفیہ کیمپ پاکستان کے سرحدی شہر میران شاہ کے کچھ شمال میں واقع ہے۔ اس کیمپ کا انتظام حرکت الانصار کرتی ہے جس کا مرکز اسلام آباد میں ہے اور جس نے، رپورٹ کے مطابق، "اسلام کے عالمی غلبے کے لئے جہاد کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

رپورٹ میں خالد اعوان، پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے اور حرکت الانصار کے ایک ممبر کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے۔ "ہمارا گروپ صحیح معنوں میں مسلم مجاہدین کا ایک انٹرنیشنل گروپ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ سرحدیں کبھی مسلمانوں کو تقسیم نہیں کر سکتیں۔ مسلمان ایک قوم ہیں اور وہ ہمیشہ ایک اکائی ہی کی طرح رہیں گے۔"

رپورٹ میں بعض پاکستانی ذرائع کے حوالے سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ 1989ء میں جنگ افغان کے خاتمہ کے بعد سے افغانستان و پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اب تک 10 ہزار سے زائد لوگوں کو فوجی تربیت دی جا چکی ہے۔ ان کیمپوں میں ٹریننگ دینے والے لیبیا، مصر اور سوڈان سے تعلق رکھنے والے وہ مجاہدین ہیں جنہوں نے جنگ افغان میں حصہ لیا تھا۔

پاکستان کے خارجہ سکریٹری کے ذریعہ سے رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ پاکستان کے عربی مدارس "اسلامی مجاہدین" پیدا کرنے کا اصل سرچشمہ ہیں۔ مغربی سفارتی ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ بات حکومت کو معلوم ہے اور وہ یہ چاہتی بھی ہے کہ ان گروپوں کو کنٹرول کرے مگر یہ حکومت کوئی موثر اقدام کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔

رپورٹ کے اس حصے کو بعض ہندوستانی اخباروں میں بھی خوب اچھالا گیا ہے جس میں اس مرکز دعوت الارشاد (جسکا مقصد، رپورٹ کے مطابق، ساری دنیا میں ایک خدائی نظام برپا کرنا ہے اور جو ایک انتہا پسند جماعت ہے) سے وابستہ 26 سالہ طارق چیمہ کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ "مصر، الجزائر اور اردن جیسے عرب ممالک کو ان پاکستانیوں کے خلاف احتجاج کا حق ہے جو ان ممالک کی "حکومت مخالف" سرگرمیوں میں ملوث ہیں مگر بحیثیت مسلمان ہمارے کچھ فرائض ہیں انہیں ہمیں پورا کرنا ہے۔"

"عالمی جہاد" میں پاکستان کے ملوث ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ مثلاً طارق چیمہ نے ایسے 56 پاکستانیوں کا نام فراہم کیا جو اب تک کشمیر، بوسنیا، تاجکستان اور فلپائن میں شہید ہو چکے ہیں۔ رپورٹ کے آخر میں رمزی احمد یوسف کا خاص طور سے تذکرہ ہے جس کا مقصد بھی یہی ثابت کرنا ہے کہ اس طرح کے عناصر پاکستان کو ایک محفوظ پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ اور اس جیسی دوسری رپورٹوں کی اشاعت سے مغربی ذرائع ابلاغ

کا مقصد ان عسکریت پسند عناصر کی مدد کرنا ہے جو سوویت یونین کے زوال کے بعد بھی ناٹو جیسی تنظیموں کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ لوگ در اصل کافی طاقتور ہیں۔ ان میں وہ فوجی جنرل بھی ہیں جنہیں ناٹو جیسی عظیم فوجی تنظیم میں بڑے بڑے مراتب اور مراعات حاصل ہیں اور ہتھیاروں کی پیداوار اور تجارت کرنے والے عناصر بھی۔ اسی کے ساتھ ان ساری کوششوں کے پیچھے مغرب کی اس ذہنیت کی کارفرمائی بھی ہے جو اپنے اس تغلب کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتا ہے جو اسے سوویت یونین کے زوال اور جنگ خلیج میں فتح کے بعد حاصل ہوا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا کی فوجی و معاشی قیادت امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کے ہاتھ میں ہے۔

اسلام پسندوں کے غلبہ کی صورت میں مغرب کو اندیشہ ہے کہ دنیا کی وہ معاشی، سیاسی اور فوجی صورت حال بدل جائے گی جو اس وقت ان کے حق میں ہے۔ اسی طرح مسلم ممالک کے حکمرانوں کو فکر ہے کہ اگر یہ لوگ برسر اقتدار آتے ہیں تو نہ صرف ناجائز طریقوں سے انہیں حاصل شدہ مراعات چھن جائیں گی بلکہ ان کے عیاشانہ مغربی طرز زندگی پر بھی قدغن لگ جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دنیا کے یہ کرپٹ، غیر ذمہ دار اور عیاش حکمراں اور مغرب کے ارباب اقتدار دونوں ملکر ایک مشترکہ خطرے کو یعنی "اسلامی بنیاد پرستی" کو کچلنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عالمی "اسلامی بنیاد پرستی" کے ایک مختصر طبقہ نے بعض جگہوں کے مخصوص حالات سے مجبور ہو کر ہتھیار اٹھا لیا ہے مگر بنیادی طور پر یہ تحریک پر امن اور جمہوری ہے۔ اس نظریے کی جھلک خود اس رپورٹ میں ان اقوال سے بھی جھلکتی ہے جو مختلف پاکستانی اشخاص کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

در اصل آج مسلم دنیا کے ہر طبقے میں یہ احساس ابھر رہا ہے کہ ان کی موجودہ زبوں حالی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی صفوں میں انتشار ہے۔ یہ انتشار خلافت کے خاتمے اور "قومی ریاستوں" کے ظہور کے بعد اور بھی سنگین ہوگیا۔ مغرب اور اس کے مسلم حلیف جو بدقسمتی سے برسر اقتدار بھی ہیں، اس انتشار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جبکہ مختلف اسلامی تحریکیں اسے ختم کرنا چاہتی ہیں۔ اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ خلافت کا از سر نو قیام ہے۔ مصر سے اٹھنے والی حزب التحریر اب ایک عالمی تنظیم بن چکی ہے جس کا مقصد خلافت کا قیام ہے۔ دوسرے مسلم ممالک میں بھی ایسے گروہ اب سرگرم عمل ہیں، یا تو علی الاعلان یا خفیہ انداز میں، جو اسی عالمی خلافت کے قیام کے لئے کوشاں ہیں۔ اس خلافت کا مقصد صرف عالم اسلام کو ایک صالح قیادت کے پیچھے متحد کرنا ہے نہ کہ دنیا کو فتح کرنا جیسا کہ مغرب پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ جو لوگ سنجیدگی سے اس نظریے میں یقین رکھتے ہیں وہ خاموشی سے اور جمہوری انداز میں اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چند جذباتی نوجوانوں نے ہتھیار اٹھالیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور فلپائن میں مسلمانوں پر مظالم کا نتیجہ ہے نہ کہ اس اسلامی بنیاد پرستی کا جسے مغرب اپنے مفاد کے پیش نظر ایک ہوا بنا کر پیش کر رہا ہے۔ "اسلامی بنیاد پرستی" کا خطرہ در اصل مغرب کا اپنا پیدا کردہ ہے۔

مناسب رشتے

1۔ خوبصورت ڈاکٹر لڑکی (عمر 23 سال قد پانچ فٹ سات انچ) کے لئے اعلیٰ خاندان کے آئی اے ایس، آئی پی ایس لڑکے سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 89

2۔ معزز سنی خاندان کی دو لڑکیوں کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ ایک لڑکی کی عمر 26 سال (قد پانچ فٹ چار انچ) تعلیم ایم اے انگریزی جو کمپیوٹر ڈپلومہ کی طالبہ ہے۔ دوسری کی عمر 24 سال اور قد پانچ فٹ 3 انچ ہے۔ تعلیم گریجویٹ اور ٹورزم مینجمنٹ کی طالبہ ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 90

3۔ مشہور فرم میں ملازم 27 سالہ ایم بی اے سنی مسلم لڑکی کے لئے برسر روزگار لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کے والد سینئر ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 91

4۔ دبئی میں اسسٹنٹ سیکشن منیجر کے عہدے پر فائز پوسٹ گریجویٹ ڈگری یافتہ کنواری لڑکی (عمر 29 سال قد 5 فٹ) کے لئے 30 سے 40 سال کی عمر کے مسلم تاجر سے رشتہ مطلوب ہے۔ خلیج میں مقیم حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 92

5۔ بمبئی میں مقیم اپنی ڈسپنسری کی مالک 33 سالہ کنواری لیڈی ڈاکٹر (قد 158 سینٹی میٹر) کے لئے موزوں سنی لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ بشرط واپسی تصویر کے ساتھ تفصیلات ارسال فرمائیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 93

6۔ نیشنلائزڈ بینک میں معقول عہدے پر فائز تیس سالہ ایم کام لڑکی (قد 160 سینٹی میٹر) کے لئے اچھے خاندان کے معقول، پروفیشنل تعلیم کے حامل تاجر لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے جس کی عمر ترجیحاً چالیس سال سے کم ہو۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 94

7۔ بمبئی میں مقیم برسر روزگار یوپی کے خاندان سے تعلق رکھنے والی شیعہ سید لڑکی (عمر 25 سال، قد 162 سینٹی میٹر) کے لئے جس کی آمدنی چار عدد میں ہے برسر روزگار یا ذاتی بزنس رکھنے والے لڑکے سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 95

8۔ بیرون ملک میں رہنے کے بعد بمبئی میں مقیم مسلم والدین کو ایک بڑی بزنس آرگنائزیشن میں کامیاب ڈیزائنر کی حیثیت سے ملازم اپنی 24 سالہ بیٹی (قد 5 فٹ 5 انچ) کے لئے ایسے لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے جس کی عمر 29 سال سے کم ہو قد 5 فٹ 7 انچ سے زیادہ ہو اور ایم اے یا ایم ٹیک کی ڈگری کا حامل ہو۔ غیر ملک میں مقیم ہو یا بمبئی یا کسی دوسرے بڑی آبادی والے شہر میں ملٹی نیشنل فرم یا غیر ملکی بینک میں ایگزیکیٹو عہدے پر ملازم ہو یا اس کے خاندان کا اعلیٰ پیمانے پر کاروبار ہو۔ خواہش مند حضرات بشرط واپسی تصویر اور بایوڈاٹا ارسال فرمائیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 96

9۔ گوری رنگت کی اردو میڈیم سے انٹر پاس لڑکی (عمر 24 سال، قد 160 سینٹی میٹر) کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ بشرط واپسی لڑکے کی تصویر اور دیگر کوائف ارسال کریں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 97

9۔ سنی مسلم خاندان کی تعلیم یافتہ مہذب لڑکی (عمر 29 سال قد 5 فٹ) کے لئے خوش شکل اور تعلیم یافتہ لڑکے سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 98

10۔ کانونٹ کی تعلیم یافتہ برسر روزگار پوسٹ گریجویٹ 24 سالہ لڑکی (قد 155 سینٹی میٹر) کے لئے 32 سال سے کم عمر کے پروفیشنل تعلیم یافتہ لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 99

11۔ اسمارٹ خوبصورت کانونٹ کی تعلیم یافتہ ساڑھے چار ہزار ماہانہ آمدنی والی چھبیس سالہ لڑکی (قد 152 سینٹی میٹر) کے لئے بمبئی میں مقیم معقول روزگار سے وابستہ، الکٹرونک کمپیوٹر انجینئرنگ میں ڈگری رکھنے والے لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 100

لڑکا

12۔ ٹاٹا کنسلٹنسی سروسز میں سافٹ ویر انجینئر کی حیثیت سے ملازم ایم اے الکٹرونکس 29 سالہ لڑکے (قد پانچ فٹ 9 انچ) کے لئے خوبصورت دراز قد پروفیشنل اور تعلیم یافتہ لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 101

13۔ سنی مسلم انصاری 29 سالہ ڈاکٹر (قد 169 سینٹی میٹر) ایم بی بی ایس ڈی سی ایچ کو کسی بھی قوم کی موزوں لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 102

14۔ خوبرو برسر روزگار 28 سالہ سنی لڑکے (قد 172 سینٹی میٹر) کے لئے معقول تعلیم یافتہ مہذب اور برسر روزگار لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 103

15۔ 27 سالہ، دراز قد خوبرو مسلم انجینئر امریکن کمپنی میں اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز لڑکے کے لئے جس کی سالانہ آمدنی پونے دو لاکھ روپے ہے خوبصورت، اسمارٹ اور ترجیحاً پروفیشنل لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 104

16۔ لکھنؤ کے معزز شیعہ مغل خاندان کے خوبرو کانونٹ تعلیم یافتہ اکلوتے بیٹے (عمر 23 سال، قد 5 فٹ 11 انچ) کے لئے انگریزی میڈیم سے پڑھی ہوئی دراز قد خاندانی خاندان (شاید اونچا خاندان کہنا چاہتے ہیں) کی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکے کا ذاتی مکان اور معقول بزنس ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 105

17۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ سید خاندان کے امریکہ سے انجینئرنگ کی ڈگری رکھنے والے اور خلیج اور امریکہ میں ملازم دو لڑکوں (عمر 25 و 27 سال) کے لئے مہذب سید یا شیخ گھرانوں کی لڑکیوں سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی خوبصورت ہو، اس کا رنگ گورا ہو اور ترجیحاً کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہو۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 106

18۔ ذاتی بزنس کے مالک تیس سالہ خوبرو لڑکے (قد 6 فٹ) کے لئے کانونٹ تعلیم یافتہ خوبصورت لڑکی سے رشتہ درکار ہے خواہش مند حضرات تصویر اور تفصیل روانہ فرمائیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 107

19۔ یوپی کے سنی سید خاندان کو اپنے سعودی عرب میں ملازم 28 سالہ بیٹے (تعلیم ایم سی اے عمر 28 سال، قد 170 سینٹی میٹر) کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے خواہش مند حضرات فوراً مطلع کریں رابطہ ملی ٹائمز باکس 108

20۔ محکمہ ریل میں تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم 32 سالہ سید (قد 172 سینٹی میٹر) کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ خواہش مند حضرات بشرط واپسی لڑکی کی تصویر اور متعلقہ کوائف کے ساتھ مراسلت کریں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 109

21۔ پانچ عددی ماہانہ آمدنی والے بی اے ایل ایل بی لڑکے (عمر 28 سال، قد 160 سینٹی میٹر) کے لئے انتہائی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ برادری کی کوئی قید نہیں ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 110

سعودی عرب میں ملازم 33 سالہ شخص (قد 5 فٹ 3 انچ) تعلیم انٹرمیڈیٹ کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ مطلقہ یا بیوہ خواتین بھی رجوع کر سکتی ہیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 111A

سعودی عرب میں مقیم اپنا ذاتی کاروبار رکھنے والے شخص کے لئے جس کی ماہانہ آمدنی سردست دو ہزار ریال ہے اور جو دوسری شادی کا خواہاں ہے موزوں رشتہ درکار ہے۔ مطلقہ خواتین بھی رجوع کر سکتی ہیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 112A

مہاندور میں مقیم خوشحال روشن خیال اور مذہب کا احترام کرنے والے خاندان کی 23 سالہ بی ایس سی، ایم اے (انگریزی) (قد ساڑھے پانچ فٹ، وزن 52 کلو) مہذب، دلکش اور خوبصورت اور زندگی کے تئیں متوازن نظریے کی حامل لڑکی کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کے والد ایک سرکاری ادارے میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور بڑے بھائی ڈاکٹر ہیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 113A

صدیقی خاندان کی بی کام اور کمپیوٹر کورس مکمل کر چکنے والی 21 سالہ گوری رنگت کی مہذب اور باسلیقہ لڑکی کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے سید، صدیقی پٹھان گھرانوں کو ترجیح دی جائے گی۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس 114A

شرح اشتہار

اس کالم کے تحت شائع ہونے والے اشتہار کی شرح حسب ذیل ہے۔

اندرون ملک فی اشتہار	100 روپے
بیرون ملک فی اشتہار	10 امریکی ڈالر

اشتہارات کی اشاعت کے جواب میں آنے والے خطوط ہم پوری مستعدی سے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک آپ کی خدمت میں ارسال کر دیتے ہیں۔

اشتہار کے ساتھ مطلوبہ رقم ملی ٹائمز انٹرنیشنل کے نام بذریعہ ڈرافت پیشگی آنا ضروری ہے۔

خلیج جائیے

خانگی زندگی کی بنیاد زوجین کے مابین

حسن تفاہم، باہمی اخلاص اور جذبۂ معاونت پر ہونی چاہیے

زمانہ قدیم سے دنیا کے ہر کونے میں ہر طبقے اور متوسل اور نادار ہر قوم میں عورتیں ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبارات سے مردوں کے ظلم کا شکار رہی ہیں۔ اور بعض مردوں کا یہ خیال ہے کہ ان مظالم کو برداشت کرنے سے عورت کی خوش بختی اور سعادت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ عورتوں پر ان مظالم کی نوعیت کا ذکر کر دیا جائے مثال کے طور پر یہ ظلم جسمانی قوت کے استعمال کی صورت میں ہوسکتا ہے جس سے کہ عورت کو ضرب وایذا پہنچے جلی کٹی باتیں سنا کر بھی اس کے احساسات کو مجروح کیا جاتا ہے اور تیسری صورت یہ بھی ہے کہ کسی ناراضگی کا انتقام لینے کی غرض سے شوہر اپنے حقوق کی ادائیگی سے پہلو تہی کرے۔

عورتیں عموماً ہر ظلم وستم کو خاموشی سے برداشت کرتے ہوئے اپنے شوہروں سے یہ سوچ کر نباہ کرتی رہتی ہیں کہ طلاق یا علیحدگی ہوجانے کی صورت میں نہ جانے انہیں کن مصائب سے گذرنا پڑے۔ عورتوں کو زدوکوب کرنے والے مردوں کو چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول وہ جن کا انحصار بیویوں پر ہوتا ہے اور عورت کو فوقیت حاصل رہتی ہے لیکن جوں ہی کسی بات پر تکرار ہوتی ہے تو نوبت مارپیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے وہ مرد ہیں جن کے مزاج میں شکی پن ہو اور وہ اپنی بیویوں پر اعتبار نہیں کرتے جو ان کے درمیان ایک کشاکش کا ماحول بنائے رکھتا ہے اور وہ کبھی کبھی دھماکہ خیز صورت اختیار کرلیتا ہے۔ تیسرے زمرے میں وہ مرد آتے ہیں جنہیں ہر وقت یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا لوہا منوانے کے لئے انہیں بیوی پر پوری طرح قابو رکھنا چاہیے۔ چوتھا زمرہ ان مردوں کا ہے جو ابتداء میں تو ازدواجی رشتوں کو صحیح خطوط پر استوار کرلیتے ہیں لیکن آگے چل کر بعض نفسیاتی عارضوں کے سبب ان پر تشدد کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے لوگ خال خال ہی ملیں گے۔

بعض مطالعوں اور جائزوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اکثر عورتیں اپنے جسم پر چوٹ اور زخم کے نشانات کو چھپاتی ہیں اور نہ ہی عزیز واقارب سے نہ ہی کسی قانونی یا سماجی ادارے سے شکایت کے لئے رجوع کرتی ہیں۔ کچھ دن کے لئے گھر میں مقید ہوجاتی ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کردیتی ہیں۔ زیادہ تر معاملات میں چوٹ کی علامتیں سر، پپوٹوں اور ہونٹوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بعض حالات میں عورتوں کو کسی جلتی ہوئی چیز سے ایذا پہنچانے کے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں مثلاً سگریٹ یا گرم سلاخ سے۔

زن وشوہر کے درمیان اختلافات اور پھر بحث وتکرار اور زدوکوب کے معاملات کے غائر مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیشتر حالات میں ان کے اختلاف اور پھر اس سے پیدا شدہ تشدد کی اصل وجہ سوء تفاہم اور بالا دستی کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق پر غلبہ کا خواہاں ہوتا ہے اور اپنے وضع کردہ اقدار واہداف پر دوسرے فریق کو عمل پیرا دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسری جانب اگر اسلام کے عائلی نظام سے روشنی حاصل کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی ضابطے کے تحت خانگی زندگی کی بنیاد حسن تفاہم اور زوجین کے درمیان باہمی اخلاص وجذبہ معاونت پر ہے۔ یہ ضابطہ شوہر کو بیوی پر حکمرانی اور تسلط قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ایک دوسرے کو اپنی حدود پہچانتے، اپنے مادی وسائل کی وسعت کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی روشنی میں زندگی گذارنے کا پیغام دیتا ہے۔ بیویوں کو زدوکوب کرنے اور عروس سوزی کی لعنت تو ہوس پرست معاشرے کی دین ہے جہاں دوسرے کی زندگی کو جہنم بنا کر اپنے لئے آسائش فراہم کرنے کی خواہش بیجا لوگوں کو عقل وہوش سے بیگانہ کردیتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے دلوں کا محاسبہ کریں اور خود سے یہ سوال کریں کہ ہماری فلاح کے لئے کون سی راہ بہتر ہے۔

رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا واجب، کوئی بھی عذر ناقابل قبول

فقہی سوال اور ان کے جواب

سوال: وہ شخص جو دل کا مریض ہو اور دو آپریشن کرواچکا ہو اور صبح وشام اس کے لئے مستقل زندگی بھر دوا کھانا ضروری ہو تو کیا اس کے لئے روزہ رکھنا ضروری ہوگا اس طرح کہ دوا کے اوقات بدل لئے جائیں۔

جواب: سعودی عرب کے جید علماء کی کمیٹی کے رکن شیخ صالح فوزان کے مطابق جو شخص پابندی سے برابر روزہ رکھنے کی استطاعت ایسے مستقل مرض کی بنیاد پر نہ رکھتا ہو جس میں دن کے وقت دوا کا استعمال ضروری وناگزیر ہو تو اسے ہر ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔

سوال: میں ایک مسجد میں امام ہوں آپ کوئی کتاب تجویز کریں جو میں نمازیوں کو پڑھ کر سنایا کروں۔

جواب: شیخ عبداللہ منیع کہتے ہیں کہ ریاض الصالحین پڑھ کر سنانا خیر وبرکت کا باعث ہوگا کیونکہ اس کتاب میں اخلاق وآداب سے متعلق صحیح احادیث شامل ہیں اور سنت رسول کا ذکر ہے۔ نمازی حضرات کے لئے امام صاحب سے پانچ یا سات احادیث کا سننا یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔ سنت رسول صلعم سے بڑھ کر کوئی اور کلام ہو نہیں سکتا۔ اور اگر اس کی کوئی قیمت ہو بھی تو سنت واحادیث رسول کی خیر وبرکت کو نہیں پہنچ سکتا۔

سوال: میں 23 سال کا نوجوان ہوں میرے والد نے مجھے پندرہ سال کی عمر سے روزے رکھنے کی ہمت دلائی۔ میں کافی عرصے تک روزے رکھتا رہا اور کبھی توڑ بھی دیتا تھا لیکن اس طرح کہ مجھے روزے کے حقیقی مفہوم سے کوئی آگاہی نہ تھی۔ لیکن جب میں بالغ وباشعور ہوگیا تو اس کے بعد سے پابندی سے رمضان کے روزے رکھنے لگا۔ اور کبھی روزہ نہیں توڑا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا گذشتہ سالوں کے روزوں کی قضا مجھ پر واجب ہے۔

جواب: شعبہ تحقیقات علمی وافتاء کے رکن شیخ عبداللہ بن جبرین کی رائے ہے کہ جب انسان 15 سال کی عمر کا ہوگیا تو اس پر ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ یہ عمر آغاز بلوغت کی ہے۔ پس وہ شخص جس نے روزے میں تساہل کیا اس وقت جب کہ وہ بلوغت کے حکم میں داخل ہوچکا تھا تو وہ ایک واجب کو ترک کرنے کا مرتکب ہوا۔ اس لئے رمضان کے چھوٹے ہوئے یا توڑے ہوئے روزوں کی قضا اس پر واجب ہوگی۔ لاعلمی کا عذر یہاں قابل قبول نہیں ہوگا۔ چھوڑے ہوئے یا نامکمل روزوں کی قضا کفارے کے ساتھ ادا کی جائے گی
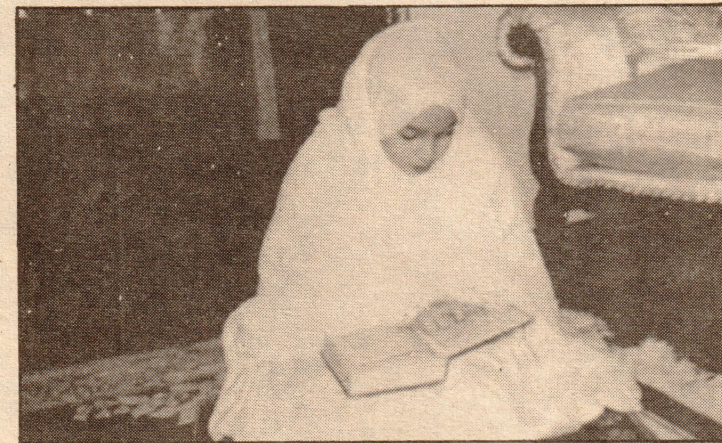
سوال: جب سعودی عرب جیسے کسی اسلامی مملکت میں رمضان کے آغاز کا اعلان ہوجائے اور جس ملک میں میں رہتا ہوں اس کا کچھ پتہ نہ چلے تو کیا حکم ہے کیا ہم سعودی عرب میں حلول رمضان کے ثبوت اور خبر کی بنیاد پر روزہ رکھنا شروع کریں گے یا اپنے یہاں اس اعلان کا انتظار کریں گے اور اسی طرح آغاز شوال یعنی یوم عید کے بارے میں بھی کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

جواب: مفتی عام، سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن باز فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لئے واجب ہے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے اور افطار کرے جہاں کا وہ خود باشندہ ہے یا جہاں وہ مقیم ہے جیسا کہ رسول اکرم صلعم کے ان الفاظ سے ظاہر ہے۔ "الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحی یوم تضحون"

سوال: میں سڈنی (آسٹریلیا) کے ایک ہوٹل میں ملازم ہوں الحمدللہ میں احکام دین پر پابند ہوں رمضان کے دنوں میں جب کہ میں روزہ رکھے ہوتا ہوں مجھے دن کے وقت بھی گاہکوں کے لئے کھانا حاضر کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی اکراہ تو نہیں ہے۔

جواب: عبداللہ بن منیع اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ رمضان کے مہینے کی حرمت واہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ اسلام کے فرض ارکان میں سے ہے۔ بغیر کسی عذر کے مثلاً حالت سفر، مہلک مرض اور انتہائی کمزوری کے عالم میں روزہ چھوڑنا یا توڑنا بڑا گناہ ہے۔ بعض اہل علم نے تو یہاں تک کہا کہ مشرکین، یہود اور نصاریٰ ماہ رمضان میں کھانے پینے کے عمل سے شریعت کو پامال کرتے ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ انہیں کھانے پینے کی اشیاء پیش کرکے رمضان کی حرمت کو پامال کرنے میں ان کی معاونت کرتے ہوں وہ بھی گناہ اور دین کے تئیں دشمنی میں شامل ہیں۔ استقامت دین کے طالب کو چاہیے کہ وہ اس ہوٹل میں رمضان کے دوران دن میں کام نہ کرے اس طرح وہ رمضان کی بے حرمتی کے عمل میں ظالموں اور مشرکوں کے ساتھ تعاون کرنے سے بچا رہے گا۔ جو شخص اللہ کی راہ میں کوئی چیز چھوڑے گا تو اللہ اس کا اچھا بدلہ دے گا۔ اگر اس نے رمضان میں دن کے وقت ہوٹل کا کام نہیں چھوڑا تو عین ڈر ہے کہ وہ گناہ سے بچ نہ سکے گا۔

آن لائن اخبارات و رسائل کا زمانہ دور نہیں

آپ ٹی وی پر اپنی پسند کا اخبار بھی پڑھیں گے

اب ٹی وی کے چینل کی طرح آپ اپنی پسند کا اخبار بھی ٹی وی کے اسکرین پر پڑھ سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بل کی ادائیگی اور پیغامات بھی بھیج سکتے ہیں۔ بہت سے سوالات کے جواب دینا اور حاصل کرنا بھی ممکن ہے۔ اس سمت میں پہلا قدم 1985 میں "ٹائم میرر کی گیٹ وے ویڈیو ٹیکسٹ سروس نے اٹھایا تھا لیکن اس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ بڑھ سکی اس لئے ایک سال کے اندر ہی اس منصوبہ کو بند کرنا پڑا۔ تقریباً ایک دہائی کے بعد اسی نہج پر کئی کمپنیاں اپنی کوششوں کو پھر بروئے کار لارہی ہیں گذشتہ سال 57 امریکی روزناموں نے آن لائن خدمات کی فراہمی کا آغاز کیا اور امسال اس زمرے میں 18 نئی کمپنیوں کا اضافہ ہوا ہے۔

حال ہی میں آئس لینڈ سے لے کر ملیشیا تک کے 750 نمائندوں کا ایک اجتماع نیو جرسی کے کلسی گروپ نامی صلاح کار کمپنی کے زیر اہتمام ہوا جس میں الکٹرونک اخبار کو رواج دینے کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا گیا۔ اس ضمن میں ایک سوال بہت اہم ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دس سال قبل ڈبے میں بند ہو جانے والے منصوبے کو اچانک اس درجہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ گیٹ وے ویڈیو ٹیکسٹ سروس سے وابستہ رہ چکنے والے ایک ماہر نے جو اب "ٹائمز" کی آن

لائن اخباری سروس کے ساتھ کام کر رہے ہیں یہ بتایا کہ اس کی وجہ لوگوں کے پاس عام طور پر پرسنل کمپیوٹر کی دستیابی ہے۔ اور زیادہ تر نئے پرسنل کمپیوٹر میں موڈیم لگے ہوتے ہیں جن کی مدد سے اس وقت بعض معروف کمپنیاں مثلاً پروڈجی، کمپیوٹر سروسز اور امریکن آن لائن پچاس لاکھ سے زائد

قارئین کو آن لائن اخباری سروس فراہم کرکے 80 فیصد زر تعاون ہتھیا لیتی ہیں۔ امریکن آن لائن کے توسط سے "سان جوس مرکری" اخبار سلیکون ویلی کی ایک چوتھائی آبادی پڑھتی ہے کیوں کہ وہاں کے ایک چوتھائی گھروں میں موڈیم دار کمپیوٹر کی سہولت حاصل ہے۔ مطالعاتی مواد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اخباری تراشوں کی فراہمی کی سروس بھی "مرکری" کے آئندہ منصوبے میں شامل ہے جس کے تحت اس سروس کے استفادہ کنندگان اپنے مطلوبہ تراشوں کے لئے الگ سے ادائیگی کریں گے اور اس طرح اس میدان میں کام کرنے والی کمپنیوں کی آمدنی میں اضافے کے خاصے امکانات ہیں۔

آن لائن اخباری سروس کے رواج پانے سے ایک بات یقینی ہو جائیگی کہ اخباری کاغذ کی قیمتیں جو بازار میں ہمیشہ چڑھی رہتی ہیں کافی حد تک نیچے آجائیں گی۔

کیلیفورنیا میں لاس انجلز ٹائمز نے ٹائمز لنک سروس کے نام سے پروڈجی نیٹ ورک کی وساطت سے آن لائن اخباری سروس کی ابتدا کی ہے جس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد سردست تیرہ ہزار ہے۔ اس سروس کو 1994 کی بہترین آن لائن پبلیکیشن کا انعام بھی مل چکا ہے اور یہ قارئین کو مطلوبہ اضافی خدمات کی فراہمی کے عوض اضافی فیس لینے لگی ہے۔ اس کمپنی کی طرف سے کی گئی مارکٹ ریسرچ سے یہ معلوم ہوا کہ مقامی معلومات کی مانگ بہت رہتی ہے اور اس خیال کے مد نظر مذکورہ کمپنی نے گھوڑوں کی ریس کے شائقین کے متعلقہ معلومات اس کی تاریخ و مقام اور دیگر تفصیلات بہم پہنچانے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے۔ دس سال قبل

آن لائن اخباری سروس کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اشتہارات اتنی کثرت سے انہیں نہیں ملتے تھے جتنے کہ آج، اور اسی لئے ان کی ممبر شپ خاصی مہنگی تھی اور جیسا کہ ہم واقف ہیں اخبارات کو اپنے بیشتر اخراجات اشتہارات کی آمدنی سے پورے کرنے پڑتے ہیں۔

لاس انجلز ٹائمز کے آن لائن اخباری سروس کے ایڈیٹر کے مطابق زمرہ بند اشتہارات کی نشاندہی کے لئے کمپیوٹر پروگرام وضع کرنا بذات خود ایک مہنگا سودا ہے۔ ایک طرف اشتہارات کا سہارا ایسا ضروری ہے تو دوسری جانب آدھے سے زیادہ اسکرین پر اشتہار کا قبضہ زیادہ تر قارئین کو ناگوار گزرتا ہے۔

آن لائن اخباری سروس کے رواج پانے سے ایک بات یقینی ہو جائیگی کہ اخباری کاغذ کی قیمتیں جو بازار میں ہمیشہ چڑھی رہتی ہیں کافی حد تک نیچے آجائیں گی۔

●

اب عورتیں دودھ پلانے سے لیکر خارجہ پالیسی تک کی معلومات بھی کمپیوٹر سے حاصل کرسکتی ہیں

گذشتہ چوتھائی صدی کے عرصے میں کمپیوٹر ٹیکنولوجی نے مغربی معاشرہ کی زندگی کو ہر اعتبار سے بدل کر رکھ دیا ہے خواہ وہ دفتر ہو یا گھر بازار ہو یا کارخانہ۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی کم مضحکہ خیز نہیں کہ ایسے دور میں جب جنسی امتیازات سے بالاتر ہونے اور مساوات لانے کی آواز تیز تر ہو رہی ہے ان تبدیلیوں پر مردوں کی بالادستی ہنوز قائم ہے۔

کمپیوٹر ٹکنولوجی کی تاریخ شاہد ہے کہ اس میدان میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مرد ہی تھے اور آج بھی سکریٹری سے لے کر ڈیٹا انٹری کلرک تک ملازمتوں میں ان کی ہی غالب اکثریت ہے اور اس مواصلاتی دور میں اگر تکنیکی علم و مہارت کو طاقت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ تو یہ طاقت بے شک مردوں کے ہاتھ میں تھی اور ہے۔ یہ صورت حال ان لوگوں کے لئے خاصی پریشان کن ہے جن کے خیال میں با اختیار عہدوں پر ماموری کے معاملے میں دونوں جنسوں کے درمیان مساوات قائم کئے بغیر عورتوں کو مردوں کے برابر نہیں لایا جاسکتا۔

دراصل عورتوں کے اہم میدانوں میں پیچھے رہنے کا سبب بعض سماجی تصورات بھی ہیں مثلاً یہ کہ کئی نسلوں سے بچیوں کو یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ریاضی، میکینک، الیکٹریکل اور الیکٹرونکس انجینرنگ جیسے موضوعات ان کے لئے مناسب نہیں ہیں اور ان کا تعلق خصوصاً مردوں اور لڑکوں کے میدان کار سے ہے۔ اس کے برعکس واشنگٹن اور کیلی فورنیا میں بچیوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جنہیں آج بھی لڑکوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے، گھر داری سنبھالنے اور بچوں کو صاف ستھرا رکھنے کی نصیحت کی جاتی ہے اور تکنیکی موضوعات میں ذہانت کا مظاہرہ کرنے والی بچیوں کو نسوانیت کے مفروضہ معیار سے کم تر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان دو شہروں پر ہی نہیں بلکہ پوری مغربی دنیا پر صادق آتی ہے انجیئرنگ کی ان برانچوں میں لڑکیوں کا داخلہ آج بھی ذہنوں کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے جن میں فیلڈ ورک کرنا پڑتا ہو۔

اگرچہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ لڑکیاں اور عورتیں تکنیکی تعلیم اور روزگار کے میدان کی طرف مائل ہو رہی ہیں لیکن ان کے اور مردوں کی تعداد میں توازن پیدا ہونے میں ابھی خاصا وقت درکار ہے۔ ایک جائزے کے مطابق امریکہ انجینرنگ اور ٹیکنولوجی کے موضوعات میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اسناد حاصل کرنے والوں میں عورتوں کا تناسب 30 فیصد کا ہے جب کہ طب کے میدان میں یہ تناسب سات مردوں پر ایک عورت کا ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نسوانیت کے مفروضہ سماجی تصورات و معیارات اور ان سے منسوب مخصوص دلچسپیوں کے علاوہ کمپیوٹر کے کام کی نوعیت کا بھی انہیں مردوں سے پیچھے رکھنے میں بڑا ہاتھ ہے جو ایک نفسیاتی پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال اور اس پر کام کرنا تنہائی اور یکسوئی طلب کرتا ہے جب کہ عورتوں کی فطرت یہ ہے کہ وہ لوگوں میں گھرا رہنا پسند کرتی ہیں اور اس لئے مشینوں کی طرف کم راغب ہوتی ہیں۔ تاہم بعض حلقوں کی طرف سے اس امید کا اظہار ہو رہا ہے کہ سائبر نیٹکس یا آن لائن مواصلات کا رواج پہلے کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کو اپنی جانب متوجہ کرے گا۔

آن لائن مواصلاتی نظام کے تحت عورتوں کے لئے ممکن ہوسکے گا کہ وہ ایک سستے سے موڈیم اور چند تحکمی کلیدوں کے ذریعے جب چاہیں اپنا رابطہ ایک ایسے نیٹ ورک سے قائم کرلیں جس سے ہزاروں افراد سے انہیں اپنے مطلوبہ موضوعات پر گفتگو کا موقع مل جائے اور دودھ پلانے سے لے کر خارجہ پالیسی تک سے متعلق معلومات حاصل ہوجائیں۔ لیکن آن لائن مواصلات سے استفادہ کنندگان کے اب تک کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی مردوں اور عورتوں کے تناسب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ امریکہ کے سب سے بڑی آن لائن تجارتی نیٹ ورک "کمپو سرو" سے استفادہ کرنے والوں میں نوے فی صدی مرد ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اور مشہور تجارتی نیٹ ورک "پروڈجی" جو اپنے ممبران کو بعض فری خدمات بھی فراہم کرتی ہے اس سے 30 فیصد سے زائد عورتیں فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ دونوں جنسوں کے درمیان اس وسیع فرق کو ختم کرکے توازن پیدا کرنے کے سردست موثر طریقے بھی سامنے نہیں ہیں۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں یہ نہت ضروری ہوگا کہ کمپیوٹر کی اہمیت اور اس کے استعمال کے طریقوں سے بچیوں کو ابتدائی عمر میں ہی واقفیت کرایا جائے اور ان کے ذہن میں جاگزیں تصورات کے غلبے کو رفتہ رفتہ زائل کیا جائے۔

●

امریکی مصنف حیرت زدہ ہے کہ آج
مسلم عورتیں روایتی پردہ کے باوجود انقلابی ہیں

وال اسٹریٹ جرنل امریکہ کا ایک مشہور جریدہ ہے جو خاص طور سے مالی معاملات کی رپورٹنگ کے لئے مشہور ہے۔ اس میگزین کے نمائندے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مغربی ایشیا اپنی معاشی و فوجی اہمیت کی وجہ سے خاص طور سے امریکی صحافت کا مرکز توجہ بنا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ہی اخبار و رسائل ایک سے زائد نمائندے اس خطے میں رپورٹنگ کے لئے بھیجتے ہیں۔ اکثر یہ صحافی چند سال علاقے میں گزارنے کے بعد صحافتی انداز کی کتابیں لکھتے ہیں جن کا مقصد اپنے اپنے انداز سے مغربی ایشیا کے مختلف سیاسی وسماجی۔ معاشی یا فوجی معاملات پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے۔

وال اسٹریٹ جرنل کے رپورٹر جیرالڈن بروکس نے ابھی حال ہی میں ایک کتاب مسلم ممالک میں یا اسلامی سماج میں عورتوں کے مقام کے بارے میں تصنیف۔ کی ہے کتاب صحافتی انداز کی ہے مگر عام مغربی انداز سے ذرا ہٹ کر ہے کیونکہ اس میں اسلام کو ہدف تنقید بنانے کی دانستہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

" خواہش کے نو حصے " یا Nine Parts of Desire کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ بروکس نے اس میں مختلف مسلم ممالک کی مسلم خواتین کی ثقافتی رنگارنگی کو اجاگر کیا ہے۔ اس بات سے انہیں تعجب ہوتا ہے کہ 20 ویں صدی کے اختتام کے وقت ایسی مسلمان عورتیں بڑی تعداد میں موجود ہیں جو روایتی پردہ میں رہنے کے باوجود انقلابی ہیں۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ کتاب میں تفصیل سے کئی مسلم ممالک کے ان قوانین کا تفصیلی ذکر ہے جو عورتوں سے متعلق وضع کئے گئے ہیں۔

بروکس کے مطابق مسلم دنیا میں کم ہی عوتوں کو صحیح معنوں میں اقتدار حاصل ہے۔ بے نظیر بھٹو، تانزو سیلر اور خالدہ ضیاء وزیر اعظم ضرور ہیں اور طاقتور بھی مگر بروکس کے نزدیک اردن کی ملکہ نور ایسی خاتون ہیں جنہیں واقعی بہت زیادہ اپنے ملک میں اثر و نفوذ حاصل ہے۔

مغربی ایشیا میں اپنے قیام کے دوران بروکس نے بہت سی مسلم خواتین سے دوستی بھی کرلی۔ فلسطینی خاتون رامیہ کا انہوں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے جن کے شوہر نے ان سے پوچھے بغیر دوسری شادی کرلی۔ بروکس کے مطابق مصر اور الجزائر میں مسلم خواتین کو مغربی انداز کی حاصل شدہ آزادی کو خطرہ لاحق ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ پردہ میں رہنے کے باوجود ایرانی خواتین کو تعلیم اور نوکری کے جتنے مواقع حاصل ہیں وہ کسی اور ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ بروکس کا اصل مقصد دراصل مسلم ممالک کی خواتین سے متعلق نوع بہ نوع قوانین اور انہیں جو مقام یا مواقع سماج میں حاصل ہیں، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ہے۔

NINE PARTS OF DESIRE
by Geraldine Brooks Anchore, $22.95

●

"اسلام پسند عیسائیت کے لئے نہیں مغرب کی نقالی کرنے والوں کے لئے خطرہ ہیں"

مائیکل فیلڈ کی کتاب، عرب دنیا میں یا Inside the Arab World اسلامی دنیا خصوصا مغربی ایشیا میں جاری اس کشمکش سے بحث کرتی ہے جو اسلام پسند جماعتوں اور مغرب نواز حکمرانوں و عناصر کے درمیان جاری ہے۔ ظاہر ہے فیلڈ کی ہمدردیاں مغرب نواز عناصر کے ساتھ ہیں۔ ان کے بقول اکثر مسلم ممالک میں اگر انتخابات ہوں تو اسلام پسند نہ صرف ان میں شرکت کریں گے بلکہ فتح بھی حاصل کرلیں گے۔ مگر فتح حاصل کرنے کے بعد فیلڈ کے مطابق یہ لوگ جمہوریت کو ختم کر کے اپنے اقتدار کو دائمی بنالیں گے۔ یہ عجیب طرفہ تماشہ ہے کہ مغرب جمہوریت کی حمایت تو کرتا ہے مگر اسی حد تک کہ اس سے مغرب نواز عناصر کو اقتدار حاصل ہو۔ اگر اس کے نتیجہ میں اسلام پسندوں کو اقتدار ملنے کا امکان ہوتا ہے تو انہیں بڑے منظم انداز سے جمہوریت دشمن ثابت کرنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔

مگر فیلڈ کی یہ رائے کم از کم قابل اطمینان ہے کہ مسلم دنیا کے اسلام پسند دراصل اپنے نظام کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض مغربی سیاست دانوں کے برعکس وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام پسند عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے لئے خطرہ نہیں ہیں بلکہ اگر یہ لوگ خطرہ ہیں تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو ہر معاملے میں مغرب کی نقالی کرتے ہیں۔ فیلڈ کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض مسلم ممالک مثلاً الجزائر اور مصر میں جن اسلام پسندوں نے اپنی حکومتوں کے خلاف ہتھیار اٹھالیا ہے ان کی تعداد پر امن جمہوری انداز میں جد و جہد کرنے والے لوگوں کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ جسے کہ بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فیلڈ کہتے ہیں کہ 1916 کے برطانیہ و فرانس کے وزرائے خارجہ کے مابین پانے والا ایک معاہدہ یعنی Sykes - Pieot Agreement کے مطابق عثمانی سلطنت کے زوال کے بعد اس علاقے کو دونوں ممالک نے باہم بانٹ لیا تھا۔ 19.3ء میں اسرائیل کا قیام اور آخر میں جنگ خلیج میں مغرب کا کردار بعض ایسے واقعات ہیں جنہیں اسلام پسند یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ امریکہ اور اس کے حلیف اسلام کے خلاف مسلسل سازش کر رہے ہیں۔ مگر فیلڈ اسے رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "سازش کے نظریے" کی بہ نسبت عرب و اسلامی دنیا کا باہمی اختلاف ان کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے۔ فیلڈ کی اس آخری رائے سے اکثر اسلام پسند بھی اتفاق کریں گے۔

INSIDE THE ARAB WORLD
by Michael Field, Harvard University Press, $ 27.50

کیا ہم جنسوں کے درمیان شادی ایک دیرینہ یوروپی روایت ہے؟

ہم جنسوں کے درمیان رشتہ ازدواج کو ڈنمارک اور ناروے کی حکومتوں کی طرف سے اجازت کے فیصلے کی پوری دنیا نے یہ کہہ کر مذمت کی تھی کہ یہ جدید اسکنڈی نیویا کا ایک دوسرا آزادانہ روپ ہے۔ لیکن ایئل یونیورسٹی میں اپنے آخری دنوں تک پروفیسر کے عہدے پر فائز جان باسویل کے نزدیک یہ فیصلہ ایک دیرینہ یوروپی روایت کے عین مطابق تھا۔

یوروپ کی تمام لائبریریوں کو ایک عرصہ تک کھنگالتے رہنے کے بعد باسویل کی رسائی ایک ایسی کتاب تک ہوئی جس کا عنوان تھا "دی میرج آف لائکنسز" (ہم جنسوں کے درمیان شادی) اس میں سات ایسی رسوم کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں سے بعض بارہویں صدی اور بعض 16 ویں و سترہویں صدی کے یوروپ میں رائج تھیں۔ یہ اس کے بعد ہی ہوا ہے کہ تقریباً پورے یوروپ میں ہم جنسوں کے درمیان شادی کو مذہبی اور قانونی اعتبار حاصل نہیں رہا۔ ہم جنسیانہ تعلقات پر عائد کردہ متعدد اقسام کی پابندیوں اور تادیبوں کے حوالے سے باسویل نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان پابندیوں کا وجود خود ہی ہم جنسیانہ تعلقات کے واقعات کا شاہد ہے۔ اپنی کتاب "سیم سیکس یونین ان پری موڈرن یوروپ، (ازمنہ وسطی کے یوروپ میں ہم جنسیانہ شادیاں، ناشر ہارپر کولنس) میں اس نے ٹھوس تحریری ثبوت اپنے دعوے کی حمایت میں پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ لاطینی، یونانی، عبرانی عربی اور فرانسیسی اقتباسات کے ترجموں کے ساتھ ضروری حواشی بھی دیے ہیں۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اس طرح کے جنسی ملاپ افراد کے درمیان باقاعدہ ہوا کرتے تھے مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا اسے شادی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ اگر شادی کی تعریف معاشرہ کی نظر میں معتبر اور مستقل جذباتی ملاپ ہے تو اسے شادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی ضروری نہیں کہ اس ملاپ میں جنس کا عنصر شامل ہو اور اسی لئے اس نے اسے "ہم جنسیانہ ملاپ" کا طبی نام دیا ہے۔ تاہم باسویل کی فکر میں ایک سقم یہ ہے کہ انہوں نے اس جانب کوئی اشارہ نہیں کیا کہ اس شادی کی رسم انجام پانے کے بعد کیا یہ سمجھا جاتا تھا کہ دو افراد ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ رہ کر زندگی گذار دیں گے یا یہ کہ وہ دونوں کسی وقت مخالف جنس کے کسی فرد سے صحیح معنوں میں شادی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔

باسویل کی کتاب پر خاصی بحث و تمحیص چل رہی ہے اور یہ آئندہ بھی مباحثوں کا موضوع بن سکتی ہے اور اگر بعض اہل علم باسویل کے خیال سے اتفاق کرلیں تو بھی جدید معاشروں میں ہم جنسیانہ شادی کے موضوع کی متنازعہ نوعیت برقرار رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ثابت کر دینا کہ آج سے چند صدیوں قبل ہم جنسیانہ شادی کے رواج کا وجود تھا ہرگز ہم سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اس رواج کو آج کے معاشرہ پر دوبارہ نافذ کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے نظریات اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے ہیں اور دیگر رجحانات ان پر غالب آجاتے ہیں مثال کے طور پر مالتھس کے نظریہ آبادی کے حوالے سے برطانوی جنسی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے رائے پورٹر اور لسلی پال نے اپنی مشترکہ تصنیف (حقائق زیست: برطانیہ میں جنسی معلومات کی تخلیق (1950 - 1650) ناشر ایئل یونیورسٹی پریس میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ 1798 میں پیش کردہ مالتھسی نظریہ آبادی نے افزائش نسل کے عمل کو سیاستا غلط اور ناموزوں قرار دے دیا تھا۔ لیکن جب اس نظریہ کا مقابلہ جنسی لذت پرستی کے حامی جارجیائی معاشرہ سے ہوا تو اس کی کمر ٹوٹ گئی اگرچہ مالتھسی خیالات کے اس وقت تک دستیاب جنسی مواد پر فوری اثرات ضرور مرتب ہوئے۔

مالتھس کے نظریہ آبادی کے منظر عام پر آنے سے پہلے جنسی موضوعات پر شائع ہونے والے رسائل میں شہوانی لذت کا بیان حقیقت پسندانہ انداز میں ہوتا تھا۔ 1694 میں پہلی بار طبع پذیر ہونے والے "ارسطو کے شہ پارے" کے مجموعے کے مندرجات خاصے بے تکلفانہ اور بعض مقامات پر رکیک بھی تھے۔ اس وقت کے نامعلوم مصنف کے مشورے کے مطابق جنسی لذت انسان کے لئے بہت اچھی اور فرحت بخش ہے۔ لیکن مالتھس کے بعد کے زمانے میں اسی کتاب کی دیگر اشاعتوں میں جنسی لذت کو تباہ کن بتایا گیا ہے جس کے قریب اسی وقت جانا چاہیے جب انسانی فرائض کے تقاضے اور مالی استعداد اس کی اجازت دیں۔

وکٹوریائی عہد کے معلمین اخلاق نے بھی اس دور کے جنسی رویوں کو کم و بیش مالتھسی نظریے کی نہج پر ہی چلانے کی کوشش کی لیکن وکٹوریائی معاشرہ کے بیشتر حصے نے جنس مخالف نصیحتوں کا پرجوش خیر مقدم نہیں کیا جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جنسی خواہش اور قبیح جنسی عمل کا مقصد خاندان کے لئے وارث اور ملک کے لئے سپاہی پیدا کرنا ہے۔ اور اسی لئے ملکہ وکٹوریہ نے نو عدد وارث اور سپاہی پیدا کر کے ازدواجی فرائض کے تئیں اپنے احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

1918 میں میری اسٹوپس کی کتاب "میریڈ لو" (ازدواجی محبت) کی اشاعت نے جنسی عمل کے دوران فریقین کی یکساں لطف اندوزی کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈال کر وکٹوریائی تصورات کی نفی کردی۔ اب تو جنس کو خطرے کی علامت قرار دینے والے مکتب فکر کی طرف سے بھی اسٹوپس کے خیال کی ہی حمایت ہونے لگی اور ارسطو کے شہ پاروں کی آئندہ اشاعتوں میں جنس کی انسانی وجود کی نشو و نما میں ایک فطری اور ضروری عنصر تصور کیا جانے لگا اور جیسا کہ جان باسویل نے اشارہ کیا ہے کہ عہد بہ عہد جنس کے تئیں مختلف رویوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ روئے زمین پر کوئی چیز نئی نہیں ہے۔

THE FACTS OF LIFE : THE CREATION OF SEXUAL KNOWLEDGE IN BRITAIN, 1650-1950. By Roy Porter and Lesley Hall. Yale University Press; 415 pages; £19.95 $35

●

Invitation Price Rs. 4/-
1 - 15 April, 1995
The Milli Times International
(India's first International Urdu Weekly)
R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-16036/94
49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018

کوئی بات نہیں

اسی اپریل میں دنیا بھر میں راک میوزک کے پرستار کرت کوبین کی موت کی پہلی برسی منارہے ہیں۔ گذشتہ سال کوبین نے انتہائی پراسرار طریقے سے خودکشی کرلی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ راک کی دنیا میں آواز اور موسیقی کا جادو جگانے والا شخص اندر سے کتنا ٹوٹا پھوٹا اور موت کے لئے کتنا بے تاب تھا ایک ایسی موت جو اسے راک اور رال کے بے ہنگام شور سے نجات دلاسکے۔

کہتے ہیں کہ انسان فرار پسند واقع ہوا ہے آپ نے بعض نوجوانوں کو دیکھا ہوگا ادھر امتحان میں فیل ہوئے اور ادھر سینما گھر کی راہ لی، ادھر کوئی حادثہ واقع ہوا اور وہ ان حادثات کے اثرات سے بچنے کے لئے ہنگاموں کی دنیا میں تلاشِ سکون کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یقینا اس سے کوئی واقعی سکون تو نہیں ملتا البتہ چند ثانئے کے لئے اصل مسائل سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس طرح آج کا ٹوٹا پھوٹا انسان اپنے آپ کو حقائق سے دور رکھ کر چند ثانیوں کے لئے عارضی مگر کھوکھلا سکون حاصل کرلیتا ہے۔

کوبین امریکی معاشرے میں پیدا ہوا تھا جہاں مجموعی طور پر انسان کے اندر کا سکون کھویا گیا ہے۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کے والدین کے آپسی طلاق کے نتیجے میں اس کا گھر ٹوٹ پھوٹ گیا اسے نہ تو ماں کی محبت ملی اور نہ باپ کی شفقت، رفتہ رفتہ اس کی محرومی نے اسے موسیقی کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ لیکن کوبین غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ وہ چند ہی سالوں میں راک میوزک کے ستاروں میں شمار ہونے لگا۔ ابھی تین سال پہلے اس کا معروف نغمہ Never Mind "کوئی بات نہیں" سب سے زیادہ بکنے والا کیسٹ قرار پایا اور آناً فاناً اس کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ گویا میوزک کی دنیا کے مشہور مائیکل جیکسن بھی اس کی مقبولیت کا مقابلہ نہ کر پائے۔

ایک اعتبار سے راک میوزک دراصل پوری امریکی تہذیب کی محرومیوں کے ازالے کی کوشش ہے۔ بالفاظ دیگر امریکی معاشرہ اپنے اندروں کے خالی پن کو چھپانے کے لئے راک میوزک کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ کوبین کے مشہور نغموں میں ان نغموں کی بہتات ہے جن میں زندگی سے تنگ آکر موت کو گلے لگانے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا نغمہ "میں اپنے آپ سے نفرت کرتا ہوں اور میں مرنا چاہتا ہوں" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

لاکھوں امریکیوں کو شب و روز تلخ حقائق سے پناہ دینے والا شخص خود اپنی محرومیوں کے ازالے کے لئے ہیروئن اور دوسری منشیات کا عادی تھا۔ گو کہ بظاہر اس نے ہیروئن چھوڑ دی تھی لیکن دوسری نشہ آور گولیوں کا استعمال جاری تھا۔ اور چونکہ پورا امریکی معاشرہ کم و بیش ان ہی مسائل میں مبتلا ہے اس لئے کوبین کے نغموں کی مقبولیت بھی فطری تھی۔ اپنے سب سے مشہور نغمے میں وہ کہتا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیا چکھا ہے لیکن ہاں اس کے چکھنے سے میرے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ یقینا یہ تلخ ہے لیکن جیسا بھی ہو کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں"۔

رنگ و رقص کی دنیا میں جو لوگ بظاہر بہت کامیاب نظر آتے ہیں، جن کے پاس پیسوں کی ریل پیل ہوتی ہے اور جو لوگ عوامی جلسوں میں چہروں پر بہت سی مسکراہٹیں لگائے نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ اندر سے کس قدر پریشان اور مفلس ہوتے ہیں کوبین کی موت نے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ دھک دھک اور دھکادھک کی موسیقی جس سے دل ہلتے، جسم پر ہیجان طاری ہوتا اور انسان کا اپنا وجود رقص و موسیقی کی دنیا میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے دراصل اس کے پیچھے وہ تمام محرومیاں ہوتی ہیں جن کا اگر بیان ہوجائے تو انسان کو عین اس دنیا میں جہنم دکھائی دے۔

کوبین گو اب ہمارے درمیان نہیں رہا لیکن اپنی دردناک خودکشی کے بعد وہ پوری دنیائے موسیقی کے لئے ایک پیغام چھوڑ گیا ہے۔ یہ کہ ہماری چمک دمک کو نہ دیکھو بلکہ اس اندرون کی فکر کرو جس کی ٹوٹ پھوٹ نے ہمیں اتنا دل برداشتہ کیا کہ ہمیں موت ہی میں پناہ نظر آئی۔